۷۸۶

شرحِ جاوید نامہ

مُرتّبہ

مولانا صبغتُ اللہ بختیاری

استاذ الحدیث۔ جامعہ عمر آباد۔ دکن

اقبال اکیڈمی

ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

مطبوعہ اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں باہتمام سید محمد شاہ ایم - اے
مہتمم اقبال اکیڈیمی ظفر منزل - تاج پورہ لاہور
سے شائع کیا

کلمۃ للناشر

"اقبال اکیڈیمی" کا معرضِ وجود میں آنا محض اس لئے تھا کہ علامہ اقبالؒ کے کلام کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جا سکے۔ اشاعت کے لئے اکیڈیمی کا ارادہ تھا کہ وہ علامہ مرحوم کے کلام کے مختلف ایڈیشن چھاپے۔ ادنیٰ، اعلیٰ۔ گراں اور سستے۔ رنگین اور سادہ اور علیٰ ہذا القیاس۔ مگر سخت افسوس ہے کہ یہ چیز اہل وطن کی بے حسی کی نذر ہو گئی۔ موجودہ دور کے مسلمان حُسن ظنّی سے کام لینا بھول گئے ہیں وہ ہر بات میں بدظنّی سے کام لینے لگے ہیں۔ ہم نے کام کرنا شروع کیا تو یار لوگ اُڑانے لگے کہ دیکھئے صاحب! اب اقبال کا نام لیکر لوگ تجارتی فائدہ اٹھانیکے منصوبے سوچنے لگے ہیں۔ کسی نے کہا کہ عزیزی جاوید کے حقوق پر چھاپہ مارا جائیگا۔ کوئی کچھ کہنے لگا۔ کوئی کچھ۔ کسی نے حوصلہ نہ بڑھایا۔ ہر طرف سے وحشت انگیز خبریں آنے لگیں۔ کارکنانِ اقبال اکیڈیمی دہل گئے اور اُن کے پائے ثبات میں لغزش آنے لگی وہ بددل ہو گئے اور نتیجہ سست رفتار۔

اب علامہ اقبالؒ کا انتقال ہوئے آٹھ سال سے اوپر کا عرصہ گزر گیا ہے مگر ان عزیزانِ اقبال نے مطلق کوئی کام نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اقبال کا منشا، مکرّر

جاوید نامہ بھی یہ لوگ نہیں چھاپ سکے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو اقبال مرحوم کے ساتھ کوئی ازلی دشمنی تھی انہوں نے نہ جانے کیوں مناسب سمجھا کہ اقبال کے کلام کی اشاعت کسی شکل میں بھی نہ ہو۔ اُنکی پالیسی "نہ خود کھیلنے اور نہ دوسرے کو کھیلنے دینے" کی ہے۔ انہوں نے اتنا بھی تو نہیں کیا کہ اقبال مرحوم کے بچوں کو ہی اشاعت کلام کا پورا فائدہ اُٹھانے دیتے۔ اس الزام کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں ہے اور وہ یقیناً مجرم ہیں مگر کوئی نہیں جو اُن سے کچھ پوچھ سکے۔

اقبال اکیڈیمی نے ان تمام موانع و مشکلات کے باوجود اقبال کے کلام کو مقبول کرنے کے لئے متعدد کتابیں شائع کی ہیں جو خدا کے فضل و کرم سے بہت مقبول ہیں۔ اور شرح جاوید نامہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اکیڈیمی کی دیگر مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی مقبول ہوگی اور اہل شوق ہماری محنت سے کماحقہٗ فائدہ اُٹھائیں گے۔

وَمَا اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ

خادم العلم

سید محمد شاہ۔ ایم۔ اے

مہتمم

اقبال اکیڈیمی۔ لاہور

دیباچہ

علامہ اقبال مرحوم کی تمام کتابوں میں سے جاوید نامہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ان کا مطالعہ قرآن زیادہ نمایاں ہے اس شاہکار میں "جدید جاہلیت" کی تمام علمی عملی گمراہیوں پر ناقدانہ روشنی ڈالتے ہوئے ایک بہترین تبصرہ کیا گیا ہے۔ دور حاضر کی تمام غلط کاریوں، غلط نگاریوں اور گوناگوں خام خیالیوں کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے اور باطل کے اُن تمام پردوں کو چاک کر ڈالا ہے جو غیر اسلامی ذہنیت نے دماغوں پر ڈال رکھے تھے۔ اس تخریب کے بعد تعمیر کا سامان بھی فراہم کیا ہے اور اسلامیات کی سچی تفسیر کرتے ہوئے اُن معنوی تخریبات کے خلاف زبردست احتجاجی آواز بلند کی ہے جو ضعیف الاعتقاد لوگوں کی طرف سے مغرب زدگی کی بنا پر ظاہر ہوتی رہتی ہیں یا اُن علمائے سوٗ کی جانب سے نمودار ہوتی ہیں جو اسلامی عقائد، اسلامی افکار اور اسلامی حقائق کی بلندی کو اپنی کوتاہ علمی کے باعث حاصل کرنے سے قاصر ہیں اور اپنی خیرہ نگاہوں کے باعث اس کی سچی روشنی سے فیض یاب نہیں ہو سکتے درحقیقت "جاوید نامہ"

'حریت، مادہ پرستی یا جدید اعتزال' کے زہرِ قاتل کا ایک بے مثل تریاق ہے۔ اقبالؒ نے اس کے ذریعہ اسلامی زندگی کی جدید تشکیل کا سامان فراہم کر کے ہماری نئی نسل کو غیر اسلامی اندازِ فکر و نظر اور غیر اسلامی کردار و عمل دونوں سے بچانے کی زبردست کوشش کی ہے۔ ہم مسلمان نوجوانوں سے خاص طور پر درخواست کرتے ہیں کہ وہ خصوصیت سے "جاوید نامہ" ضرور پڑھیں۔

صبغتہ اللہ بختیاری

استاذ الحدیث جامعہ عمر آباد دکن

"مناجات"

جاوید نامہ کی ابتدا ایک عجیب مناجات سے ہوتی ہے۔ جس میں "صاحبِ شکوہ" نے اپنی شکوہ سنجی کی پوری شان باقی رکھی ہے

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست؟ این سپہرِ نیلگوں حیرانِ کیست؟

اس شعر میں آیۂ تسخیر سے مراد قرآنِ عزیز کا وہ حصّہ ہے جس میں انسان کے لیے قُوائے عالم کی تسخیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کو قرآن نے بہت سے مقامات پر بیان فرمایا ہے۔

سَخَّرَ لَكُمْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ	جو کچھ آسمان و زمین میں ہے۔ اللہ نے
مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۝	تمہارے فائدے کے لیے اپنے قبضہ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ	میں لے لیا ہے۔ غور و فکر کرنے والے
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	لوگوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	اور اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور
وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ	زمین کو پیدا کیا اور بادلوں سے مینہ

مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ
فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ
وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ
وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ
وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ
لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝

برسایا اور اُس سے تمہارے کھانے
کو میوے پیدا کیے۔ اور جہاز تمہارے
تابع کر دیئے ہیں تاکہ وہ سمندروں میں
اسکے حکم سے چلتے رہیں اور اسی خدا نے
تمہارے لیئے دریاؤں کو مسخر کر دیا ہے اور
سورج اور چاند بھی مسخر کر دیئے ہیں کہ
ایک خاص نظام کے تحت گردش کرتے
رہیں اور رات دن کا الٹ پھیر بھی تمہارے
فائدے کے لیئے ہے۔ اور تمہیں اُس
خدا نے وہ سب چیزیں عطا کر دی ہیں جو تم نے اُس سے مانگیں۔ اور اگر تم اللہ
کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ہرگز گن نہ سکو گے۔

ان دو آیتوں کے علاوہ بے شمار آیتیں اس مضمون کی اور مل
سکتی ہیں جن سے تسخیر کی حقیقت معلوم ہوگی مگر مزید تفصیل کے
لیئے اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تسخیر کا لفظ ایک جامع مفہوم ادا کر رہا
ہے جس کے تحت ہر چیز کا طوعاً و کرہاً، ہر طرح سے تابع و مسخر ہونا
ضروری ہے انسان کی کائنات و ما فیہا کے ساتھ جو خاص
نسبت ہے اس کو واضح کرنے کے لیئے اس سے اعلیٰ تعبیر ممکن

ہی نہیں قرآن مجید کی ان صراحتوں سے پیشتر انسانی عظمت کا
تصوّر اس سے کہیں کم تر تھا اور تمام مذاہب و اقوام کا تصور انسان
کے متعلق نہایت ناقص تھا۔ لیکن قرآن مجید نے انسان کے لیئے
"تسخیر کائنات" کا اعلان کر کے نہ صرف اس کی عظمت کا اعلان فرما دیا
بلکہ انسانی عقل کے لئے ایک بلند ترین نصب العین بھی متعین کر دیا اسی
میں تمام کائنات کی قوتوں کا اور ان پر تصرف کا مفہوم مضمر ہے،
آگ، بجلی، پانی، وغیرہ پر جو انسان کی حکمرانی ہے وہ اسی تسخیر کا توفیضِ
عام ہے اور ابھی معلوم نہیں کہ کائنات کے کون کون سے رازہائے
سربستہ کھلنے والے ہیں۔

سَتُبْدِیْ لَکَ الْاَیَّامُ مَا کُنْتَ جَاهِلًا ۝ وَیَاْتِیْکَ بِالْاَخْبَارِ مَا لَمْ تُزَوِّدِ

"علمِ اشیاء"

مناجات کے بعد اقبال اس چیز کی وضاحت کرتے ہیں کہ "غربی قوموں کے اکتشافات پر جو لوگ سر دھن رہے ہیں یہ اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ "حکمت اشیا" فرنگی زاد نہیں ہے بلکہ اس کی اصل حقیقت "لذتِ ایجاد" ہے جو خدا نے انسان میں ودیعت کر دی ہے۔

ما زدانِ عَلَّمَ الاَسْمَاءَ کہ بود؟	مستِ آن ساقی و آن صہبا کہ بود؟
برگزیدی از ہمہ عالم کرا؟	کردی از رازِ درون محرم کرا؟
اے ترا تیرے کہ ما را سینہ سفت	حرفِ "اُدعُونی" کہ گفت و با کہ گفت؟

ان اشعار میں اُن قرآنی آیتوں کی طرف اشارات کیئے گئے ہیں جن میں خلافت آدم کا تذکرہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو منصب "خلافتِ الٰہیہ" سے نوازنا چاہا تو فرشتوں سے بر سبیلِ تذکرہ فرمایا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں فرشتوں نے نیاز مندانہ طور پر عرض کیا کہ سابقہ خدمتیں برابر انجام دی جا رہی ہیں، تسبیح و تقدیس و تحمید وغیرہ میں ہم برابر مصروف ہیں یہ نئی خدمت بھی ہمارے سپرد کر دی جائے ہم ہر طرح حاضر ہیں اس پر ارشادِ باری ہوا کہ "تکوینی اسرار"

کا علم تم کو نہیں اور وہ مصالح جو آدم کی تخلیق اور اس کی خلافتِ ارضی سے متعلق ہیں تمہارے بس کی بات نہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر آدم کی برتری و خصوصیت جتلائی اور تعلیم اسما یعنی "حقائق اشیاء" کی تعلیم فطری دے کر فرشتوں سے دریافت کیا کہ بتلاؤ "اسماءِ مسمیات" کیا ہیں؟ فرشتوں نے صاف عرض کر دیا کہ ہمیں تو اُسی قدر علم ہے جس قدر تو نے عطا فرمایا ہے اور وہ ہماری فطری استعداد کے مطابق ہے۔ پھر آدم نے حکمِ الٰہی سے ان کو سب کچھ بتلا دیا۔ جب فرشتوں کا اور آدم کا تکوینی فرق واضح ہو گیا تو ارشاد ہوا "سجدہ کرو" سب نے سر نیاز جھکا دیا مگر ابلیس نے سرکشی کی اور سجدہ سے انکار کر دیا اُسے درگاہ الٰہی سے نکال دیا گیا بہر حال مذکورہ اشعار میں "تعلیم اسما" کی طرف اشارہ ہے جس سے مراد کائنات مادی کے وہ تمام حقائق ہیں جن کو دریافت کرنے کی صلاحیت و استعداد اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی تھی اور اک، عقل، احساسات دنیا کی مفید و مضر چیزوں کی خاصیتیں انسانی زندگی کے وہ تمام لوازم جو انسان اپنی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ فراہم کرتا جائے گا سب اس میں داخل ہیں۔ دوسرے شعر میں ان آیات کریمہ کے مضمون کے طرف راہنمائی کی گئی ہے جن میں انسانی شرافت و فضیلت کا

بیان ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات اور کائنات کی ساری چیزوں پر انسان ہی کو خلیفۃ اللہ بنا کر فضیلت دی گئی ہے۔ تیسرے شعر میں ایک خاص انداز کے ساتھ دریافت کیا جاتا ہے کہ۔ حرف "ادعونی" کس سے کہا گیا ہے، اور ان آیات کریمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ	اے پیغمبر اسلام! جب تم سے میرے متعلق
فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ	میرے بندے دریافت کریں تو کہدو کہ
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ	بے شک میں قریب ہوں پکارنیوالے
وَالْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ	کی پکار سنتا ہوں پس انہیں میری باتیں

(سورہ بقر)

مان لینی چاہئیں اور مجھ پر ایمان لانا چاہیئے تاکہ وہ لوگ رشد و ہدایت پائیں)

اس کے بعد پوری حقیقت چند لفظوں میں بے نقاب کر ڈالی کہ تیرا ہی روئے زیبا میرا ایمان اور میرا قرآن ہے لیکن میری جانِ زار کو تو نے اپنے جلوہ سے محروم رکھا ہے!

روئے تو ایمانِ من قرآنِ من　　جلوہ داری دریغ از جانِ من

لیکن اس کے باوجود اقبالؒ نے انسانی بے بسی کو بھی اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "آج زیر گردوں "خلیفۃ اللہ" ہونے کے باوجود اپنے وجود کو غربت میں محسوس کر رہا ہے۔ پس تو "اِنِّیْ قَرِیْبٌ" کہکر میری مجبوری و دوری کو پھر ختم فرمادے اور مجھے اپنی بے پایاں رحمت سے

قریب کر لے"

"زبرِ گردوں خویش را یابم غریب　　زاں سوئے گردوں بگو آں قریب"

ذاتِ خداوندی سے دل بستگی

مناجات کے بعد تمہید آسمانی شروع ہو جاتی ہے جس میں "حقائقِ غریبہ" بتانے کے بعد کہا جاتا ہے۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را اوست سید جملہ موجودات را

یعنی جو جمالِ ذاتِ الٰہی کے عشق و محبت کا متوالا ہو جاتا ہے وہ تمام موجودات کا سردار کہلاتا ہے یعنی ساری کائنات اس کے آگے سر بسجود رہتی ہے اور وہ ان سے خدمت لینے لگتا ہے، مقصود یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو جانا چاہیئے چونکہ غیر اللہ کی تمام قوتیں اسکی خادم ہیں ان میں سے کسی کے آگے اس کو اپنا سر نیاز جھکا کر خود کو ذلیل کرنا نہیں چاہیئے یہی حقیقت ہے جس کو قرآن نے پیش کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ تمام جنوں اور انسانوں کو میں نے

الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ اپنی "عبادت" ہی کیلئے پیدا کیا ہے

پھر تمہید آسمانی کی ابتدا شروع ہو جاتی ہے جس میں عارف رومی کی روح آشکارا ہو کر "اسرارِ معراج" کی دلپذیر شرح کرتی ہے اور

"زندہ رود" سازِ رومی سے مست ہو کر بے اختیار ایک غزل گاتے لگتا ہے پھر وہی رومی اور "زندہ رود کی" گفتگو شروع ہو جاتی ہے جس میں موجود نا موجود اور شواہد ثلثہ" اور مقام تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کے حقائق واضح کئے جاتے ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ جب سلطان (چارٹر) تمہارے قبضہ میں آجائے گا تو زمین کیا چیز ہے آسمان کو بھی توڑ سکتے ہو پھر ایک عجیب و غریب دل فروز و جان نواز نکتہ بتایا جاتا ہے۔

نکتۂ الا بسلطان یاد گیر ورنہ چوں مور و ملخ در گل بمیر

مندرجہ بالا شعر میں قرآنِ مجید کی مندرجہ ذیل آیت کی طرف اشارہ ہے۔

یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ	اے جن و انس کے گروہ! اگر تم آسمان
اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا	و زمین کے کناروں سے نکل بھاگنے
مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ	کی قدرت رکھتے ہو تو بھاگ جاؤ
وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا	مگر سلطان (خدائی چارٹر) کے بغیر
تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ۔	بھاگ ہی نہ سکو گے۔

مراد یہ ہے کہ انسان کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ کے ملک اور اس کی وسیع سلطنت کی حدود سے کہیں نہیں بھاگ سکتا جب یہ حقیقت آشکارا ہو گئی تو انسان کو اپنے خالق حاکم، اور مالکِ حقیقی سے پورا وابستہ ہو جانا چاہیئے اور اگر ایسا نہ ہوا تو مور و ملخ کی طرح دنیاوی زندگی ختم کر کے

مرجانا پڑے گا اور مجازات کے روحانی عالم میں "یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا" کہہ کر حسرت و ندامت سے مادی زندگی کے برباد ہونے پر اور روحانی زندگی کی محرومی پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

ان حقائق کے بعد عارف رومی کی روح نے زندگی کی تفسیر کی ہے اور عقل و عشق کا موازنہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ آدمی وہی ہے جس میں "دیدِ دوست" کی تمنائے بے پایاں ہو جو اس کو سراسر نظر بنا دے اور زمان و مکان کو اپنے احوال جان کر سمجھنے لگے پھر جسم و جان کی حقیقت آشکارا کی گئی ہے زمان و مکان کی روحِ رواں کا مسافر کو عالمِ علوی کی سیاحت پر لے جاتی ہے اور انجم کی زمزمہ سنجیاں شروع ہو جاتی ہیں اور زمزمہ انجم کی تان اس پر ٹوٹ جاتی ہے۔

ضربِ قلندری بیار سدِ سکندری شکن ‏ ‏ ‏ رسمِ کلیم تازہ کن رونقِ ساحری شکن

فلکِ قمر میں پہنچ کر بہت سے عجیب و غریب غار نظر آتے ہیں۔ ایک غار میں وہ عارفِ ہندی خلوت گرفتہ ہے جس کو ہندوستان والے "جہاں دوست" کہتے ہیں "جہاں دوست" رومی سے دریافت کرتے ہیں تمہارے ساتھ کون شخص ہے رومی اپنے ساتھی کا تعارف ایک انوکھے انداز میں کراتے ہیں۔ پھر جہاں دوست اور رومی میں مکالمہ شروع ہو جاتا ہے عارف ہندی اپنی نو باتیں پیش کرتے ہیں اور "جلوہ سروش" کی جلوہ فرمائی

کے بعد "نوائے سروش" کی نغمہ سنجیاں شروع ہو جاتی ہیں "نوائے سروش" میں اقبال نے قرآن کے فہم و تدبر کا وہ بے مثل نمونہ پیش کر دیا ہے جس کو خود انہوں نے آزما لیا ہے جن لوگوں کو قرآن کے علوم و حقائق کا صحیح ذوق ہے وہ ضرور اس سے لطف اندوز ہونگے مگر جو شخص حجابوں کی دنیا میں زندہ رہا وہ اسی طرح حجابوں کے آغوش میں مر کر فنا ہو جائے گا۔ دنیا کی مادی زندگی اور عقبیٰ کی روحانی زندگی دونوں تیرے لیئے حجابات بن گئی ہیں۔ حالانکہ چاہیئے تھا کہ اپنی دنیاوی زندگی میں تو حجاباتِ نظر کو اُٹھا دیتا اور آخرت میں خود بخود تیری مادی نظر کے حجابات اُٹھ جاتے اور تیری نگاہیں رومانی مناظر کے لطف سے محظوظ ہوتیں۔

فہمِ قرآن

اس کے بعد اقبال نے اپنے فہمِ قرآن کا حال بتایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم
تقدیرِ امم دیدم پنہاں بکتاب اندر

جب میں نے پیچ و تابِ رازی سے نجات پائی، متکلمانہ قیل و قال اور نفاظیوں کے جنگ و جدال سے نکل کر قرآنِ عزیز اور اس کے فطری اسلوبِ استدلال کو سمجھنا شروع کیا تو مجھ پر یہ رازِ حقیقت آشکارا ہو گیا کہ قرآن میں تقدیرِ امم پوشیدہ ہے اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بہت سی قوموں کو رفعت و سربلندی عطا فرماتا ہے اور اسی کی وجہ سے سینکڑوں اینٹیں حضیضِ ذلت میں جا گرتی ہیں یعنی جن قوموں نے اپنے خود ساختہ طریقِ فکر و عمل کو چھوڑ کر اللہ کی کتاب کو اپنی اجتماعی زندگی کا پروگرام بنا لیا وہ کامیاب و کامران ہوئیں اور جنہوں نے فطرت کے اصولِ حقّہ سے انحراف کیا وہ خائب و خاسر ہوئیں۔

اس دور میں اور ہر دور میں قرآن کی پیش کی ہوئی حقیقتوں سے دور رہنے کا سبب جس نے قرآن کے عملی پہلو سے لوگوں کو دور رکھا ہے یہ

ہے کہ عام طور پر عہدِ نبوت، عہدِ صحابہ، اور عہدِ تابعین کے بعد لوگوں نے قرآن کے فہم کے لئے ایک پست معیار قائم کر لیا اور یہ چیز قرآن کے محاورات اس کی ترکیبوں اور معانی و مطالب کے فہم تک میں قائم ہو گئی، اور عہدِ سلف کے بعد سے جتنے "مفسرینِ قرآن" پیدا ہوئے ان کا فکری معیار ایک رو بہ تنزل طریق کے طرف جاتا رہا نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ جب براہ راست قرآن کا فہم و تدبر متروک ہو گیا اور "خام فلسفیت" یا اعتزال کی وجہ سے مسلمان معقولیں پر اس دور کے "دعقلی علوم" کا تسلط ہو گیا تو انہوں نے قرآن کی سیدھی سادھی بے میل فطری تعلیمات کو بھی معقولیانہ انداز سے دیکھنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کو انسانی علوم پر ڈھالا جانے لگا جب "اربابِ اعتزال" نے یہ ہنگامہ آرائیاں برپا کیں تو اُن کے مقابلہ میں پہلے دو جماعتیں پیدا ہوئیں۔ پہلے گروہ نے سلفیت کا دامن مضبوطی سے تھام لیا، اور دوسرے گروہ نے مدافعت اسلامی کے نام پر اربابِ اعتزال سے رد و کد اور بحث و مناظرہ کرنا شروع کر دیا اور انہیں کے طرزِ استدلال کو قبول کر کے اعتزال سے پیدا ہونے والے شبہات کا جواب دینا شروع کیا اور اپنے عقائد تو سلفیانہ رکھے مگر اس کے لیئے طرزِ تفسیر میں ان فلسفیانہ موشگافیوں کو استعمال کیا جن کے باعث دو جدلیات" کا ایک وافر حصہ اسلامی لٹریچر میں پیدا ہو گیا یہ گروہ جب

اپنے ذاتی عقائد کا اظہار کرنا تو اپنا مسلک سلفی بتلاتا اور جب سلفی عقائد پر اعتراضات ہوتے تو معترضین کا جواب دینے کے لیئے غیر شعوری طور پر ان اصولِ استدلال کو تسلیم کر لیتا جو روحِ قرآن سے کلی طور پر اپنے مزاجِ طبعی کے لحاظ سے الگ تھلگ تھے۔ اس لیے اس طبقہ نے جس قدر غیروں کے شکوک و شبہات کو فنی و علمی شکل دے دی ہے اس قدر جوابات کی "دنیائے نو" کی تعبیر نہیں کی اور بسا اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ جس قدر سلجھانے کی کوشش کی گئی اُلجھاؤ بڑھتا ہی گیا اور اس چیز کا پورا استیصال ان سے نہ ہو سکا جس کے لیئے انہوں نے کمرِ ہمت باندھی تھی اسی طبقہ کو متکلمین کا گروہ کہتے ہیں اور ان کے سب سے بڑے نمائندے علامہ فخرالدین رازی ہیں ان دو طبقوں کے بعد عالمِ اسلامی میں ایک تیسرا ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے متکلمین کے اصول ان کے مسلمہ کلیات اور تمام عقلی ضوابط پر ایک زبردست تنقیدی نظر ڈالی اور ان کو کانٹ چھانٹ کر از سرِ نو ایک "جدید فلسفہ" کی بنیاد رکھی پھر ان تمام شکوک و شبہات کو جو متکلمین کے یہاں زبردست سمجھے جاتے تھے حل کر کے رکھ دیا اور یونانی عقلی علوم کی ذہنی مرعوبیت کا طلسم ٹوٹ گیا اس طبقہ میں "منصبِ تجدید" امام ابنِ تیمیہ کو حاصل ہے یہ چند سطریں ناگزیر تھیں تا کہ ؎

چوں سرمۂ رازی را دیدہ فرو شستم   تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بکتاب اندر"

کو سمجھ لیا جائے اب شعر کا مطلب سمجھئے، علامہ اقبال "تکلم" سے "سلفیت" اور عرفانِ حقیقت کی طرف آنے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جب متکلمین کے وضعی طریقوں کو چھوڑ کر قرآن کے فطری طرزِ استدلال پر تدبر کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس میں "تقدیرِ اُمم" پوشیدہ ہے۔

اس کے بعد وادی "برغمید" کی طرف حرکت ہوتی ہے جس کو فرشتے "وادی طواسین" کے نام سے یاد کرتے ہیں یہاں عارف رومی شعر کی حقیقت پر کلام فرماتے ہیں کہ اس کی کونسی قسم مفید ہے اور کونسی غیر مفید و مضر ہے۔

پیغمبری کی حقیقت

شعر را مقصود اگر آدم گری ست　　شاعرے ہم وارثِ پیغمبری ست

اس کے بعد اقبال عارفِ رومی سے "پیغمبری" کی حقیقت دریافت کرتا ہے اور وہ اس کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

گفتم از پیغمبری ہم باز گوئے　　سرِ او با مرد محرم باز گوئے

گفت اقوام و ملل آیاتِ اوست　　عصرہائے ما زمخلوقاتِ اوست

از دمِ او ناطق آمد سنگ و خشت　　ماہمہ مانند حاصل او چو کشت

پاک سازد استخوان و ریشہ را　　بالِ جبریلے دہد اندیشہ را

ہائے و ہوئے اندرونِ کائنات　　از لبِ او نور و نجم و نازعات

آفتابش را زوالے نیست نیست　　منکرِ او را کمالے نیست نیست

رحمتِ حق صحبتِ احرارِ او　　قہر یزداں ضربتِ کرارِ او

گرچہ باشی عقل کل از دے حرم　　را نکہ او بیند تن جان را بہم

یعنی عارف رومی سے اقبال نے پیغمبری کی حقیقت دریافت کی عارف رومی نے کہا کہ قومیں اور ملتیں پیغمبری کی نشانیاں ہیں ہمارے تمام زمانے پیغمبری ہی سے بنے ہوئے ہیں، پیغمبری وہ چیز ہے کہ سنگ و خشت

بھی اس کے دم سے ناطق بن جاتے ہیں، پیغمبری لہلہاتی ہوئی کھیتی ہے اور انسانیت اس کا حاصل، پیغمبری استخوان وریشہ کو پاک کر دیتی ہے اور فکر و اندیشہ کو "بالِ جبریل" عطا کرتی ہے کائنات میں یہ سب کچھ ہاؤ ہو پیغمبری ہی کے طفیل سے ہے نجم، نور اور نازعات کی تعلیمات بھی پیغمبری ہی سے ملتی ہے۔

ان اشعار میں بتایا گیا ہے کہ قرآنی تعلیمات رسول ہی کی زبانی انسانوں تک پہنچتی ہیں جس سے کائنات کے اندر ہنگامہ آرائیاں نظر آتی ہیں مثلاً سورہ نجم اگرچہ ایک مختصر سی مکی سورت ہے مگر اس میں نبوت اور نبوتِ محمدی کی حقیقت کو ایک دل نشین طریقہ پر سمجھایا گیا ہے اور اسی طرح سورۂ نور میں بتایا گیا ہے کہ قرآنِ عزیز کی فطری تعلیم سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے انسان کو رذائل سے مجتنب ہو کر فضائل سے آراستہ ہو جانا چاہیئے تاکہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی بارگاہِ قدس تک پہنچنا آسان ہو اور "نازعات" میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی محض یہ مادی زندگی ہی نہیں بلکہ یہ مادی زندگی ایک روحانی زندگی کا پیش خیمہ ہے یہاں اعمال انسانی میں جو کچھ بھی خیر و شر ہوگا آخرت کی روحانی زندگی میں اس کی جزا ملے گی اور مجازات اعمال کو ثابت کرنے کے لیے تو میں کے عروج و زوال سے استشہاد کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس

فطری تعلیم کے انکار کے باعث فرعون اور فرعونیوں کو ہلاکت سے دوچار ہونا پڑا۔

پیغمبری کا آفتاب جہاں تاب کبھی زوال پذیر نہیں ہوتا پیغمبری کا منکر درجۂ کمال پر نہیں پہنچ سکتا صاحب رسالت کے فیضان محبت سے مستفید ہونے والوں کی محبت رحمتِ حق ہے اور پیغمبری کی ضرب اللہ کا قہر و غضب ہے اگر انسان عقلِ کل بھی بن جائے پھر بھی نبوت کی راہ نمائی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ تن و جان کو ہم دیکھنا اور روحانیت و مادیت میں ایک مناسب امتزاج پیدا کرنا جس سے انسان کی خودی ترقی یافتہ ہو جائے انہیں کا کام ہے اس کے بعد "طواسینِ رسل" کے نام سے مہاتما گوتم بدھ، زردشت، حضرتِ مسیح، اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ یہاں گوتم اور زردشت کو نبی قرار دیا گیا ہے اس لیئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر زمان و مکان، ہر قوم و ملک، ہر خطۂ زمین پر اپنی طرف سے حق کا پیغام پہنچانے والوں، اپنے رسولوں اور نبیوں کو بھیجا ہے جنہوں نے انسان کو، اللہ کی ذات و صفات کی توحید، اعمال انسانی کی مجازات، اس مادی دنیا کے بعد ایک روحانی اخروی زندگی کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ انسانی تخلیق و تکوین کا مقصد محض حیوانی خواہشات

اور نفسانی جذبات کی تسکین ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبے میں ایسی پاکیزہ عملی حالت پیدا کر لیتی ہے جو اللہ کی خوشنودی کا باعث ہو اور اس کے لیے خود اسی نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ انسانی زندگی کا دستور العمل دے دیا ہے تاکہ انسان اپنی انفرادی، اجتماعی، مذہبی، سیاسی اور اقتصادی، ہر حالت میں عدل و قسط کا پابند ہو جائے۔ چنانچہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس سلسلۂ نبوت و رسالت کی آخری کڑی تھے جن پر دین اسلامی کی تکمیل اور نعمتِ الٰہی کا اتمام ہو چکا اور قیامت تک اقوام و ملل اور ممالک و دول کے لیے آپ کی تعلیمات خضرِ راہ ہیں۔ باقی جو کچھ ہے وہ صرف سرابِ زندگی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ (نساء ع ۲۳)

اے پیغمبرِ اسلام! ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسولوں کو بھیجا ہے جن میں سے بعض کا قصہ تم کو سنایا اور بعض کا نہیں، رسولوں کو خوشخبری سنانے والے (اور اعمال کے بُرے نتائج سے) ڈرانے والے بنا کر اس لیے بھیجا گیا ہے کہ لوگوں پر اللہ کی حجت باقی نہ رہے (اللہ کی قوت و حکمت کا تقاضا ہی یہ تھا) کیونکہ وہ عزیز و حکیم ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ (مومنون - ع ۸)

اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے ایسے رسول کو بھیجا ہے جنکا قصہ تم کو سنا دیا ہے اور بعضوں کا نہیں سنایا، کسی رسول کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی آیت لاسکے جب اللہ کا حکم آچکتا ہے تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اہلِ باطل اس موقع پر ناکام ہو جاتے ہیں۔

ایک جگہ اس طرح فرمایا گیا ہے ۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۔

اور ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا اور حکم دیا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی اطاعت سے اجتناب کرو۔

رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے کہا جاتا ہے ۔

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرًا

"اے پیغمبر اسلام! ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی اللہ کا رسول نہ آچکا ہو"

ان تمام قرآنی صراحتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسولوں کی دو قسمیں ہیں، بعض کا ذکر قرآن عزیز نے کر دیا ہے خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی اور بعض وہ ہیں جن کا قرآن نے ذکر نہیں کیا، مگر یہ صاف فرما دیا ہے کہ ہر امت میں اللہ کا رسول بھیجا گیا ہے کیونکہ رسولوں کو بھیجنے کے بعد ہی اللہ کے بندوں پر اللہ کی حجت تمام ہو سکتی ہے، جن رسولوں، اور نبیوں کی تفصیلی حالت قرآن نے بیان کی ہے ان پر اسی تفصیل کے مطابق ایمان لانا چاہیئے اور جن کا کوئی ذکر اجمالی بھی نہیں کیا گیا ہے ان پر مطلق ایمان لانا چاہیئے کہ ہر جگہ اللہ کے نبی آ چکے ہیں، مگر ہمیں یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں ہے کہ جس علم کی تفصیل سے اللہ نے ہمیں بے بہرہ رکھا ہم اس کی راز کشائی کے درپے ہو جائیں اور محض تاریخی طور پر حکم لگائیں کہ فلاں نبی تھے فلاں رسول تھے، جیسا کہ مہاتما گوتم بدھ، اور زرتشت، کے متعلق ہم صاف طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ نبی تھے کیونکہ ان کی تصریح قرآن نے نہیں کی اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ برے تھے ممکن ہے کہ وہ نبی ہی ہوں، یا کسی نبی کی امت کے صلحاء ہوں کیونکہ ان کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سچائی اور نیکی کی تعلیم دی تھی، ایمان عمل صالح، اور مجازاتِ اعمال پر زور دیا تھا، بہرحال جو لوگ ان کو نبی کہتے ہیں وہ مجرد زعم ہے، محض تاریخ کی شہادت کافی نہیں ہے اور

وہ بھی بہت سے اختلاف میں الجھی ہوئی ہے، زردشت، کے متعلق خود ان کی ہستی، اور ان کے ظہور کا زمانہ بھی ایک مختلف فیہ مسئلہ بن گیا ہے، بعضوں نے تو اس تاریخی ہستی ہی کا انکار کر دیا ہے اور بعض نے شاہ نامہ کی روایت کو ترجیح دی اور گشتاسپ والا قصہ تسلیم کر لیا ہے۔ بعضوں نے ان کا زمانہ ایک ہزار برس قبل مسیح قرار دیا، بعضوں نے یہ مدت دو ہزار برس تک بڑھا دی، اس طرح محل کی تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختر، بعضوں نے خراسان، بعضوں نے میڈیا، اور شمالی ایران قرار دیا، اسی طرح اور شخصوں کا بھی حال ہے۔ لہذا ہم کو ان حضرات کی نبوت و رسالت پر حکم لگانا آسان نہیں ہے اور عقائد کے باب میں قطعی دلائل کے بغیر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

ہاں بعض صوفیاء کرام کے مکاشفات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نبی تھے، محض کشف کوئی دلیل و حجت نہیں بلکہ اگر شرعی دلیل کے معارض ہو تو چھوڑ دینے کے قابل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا رجحان بعض صوفیاء کے مکاشفات اور مؤرخین کے رجحانات کی طرف ہے مگر حقیقتِ حال وہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے۔

نوحۂ ابوجہل

"طاسین مسیح" میں مصلح روس، حکیم طالسطائی کا ایک خواب ذکر کیا گیا ہے جس میں امت مسیح کی شکایت کی گئی ہے پھر طاسین محمد میں روحِ ابوجہل کا حرمِ کعبہ میں نوحہ ایک عجیب پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے، جس سے اسلامی تحریک کا مزاجِ طبعی اور اس کا ابتدائی اٹھان معلوم ہو جاتا ہے۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ | از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود | نوجواناں را ز دستِ ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری ست | این دو حرفِ لا الٰہ خود کافری ست
تا بساطِ دینِ آبا در نورد | با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد
پاش پاش از ضربتش لات و منات | انتقام از وے بگیر اے کائنات!
دل بغائب بست و از حاضر گسست | نقشِ حاضر را فسونِ او شکست
دیدہ بر غائب فرو بستن خطا ست | آنچہ اندر دیدہ می ناید کجا ست
پیشِ غائب سجدہ بردن کوری ست | دینِ نو کور است و کوری دوری ست
خم شدن پیشِ خدائے بے جہات | بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوات
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب | از قریش و منکر از فضلِ عرب

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ

احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

ابنِ عبداللہ فریبش خوردہ است
رستخیزے بر عرب آوردہ است

عترتِ ہاشم ز خود مہجور گشت
از دو رکعت چشمِ شاں بے نور گشت

ان اشعار میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو قرآن اور حاملِ قرآن کی وجہ سے سرزمینِ عرب میں ظاہر ہوا اور پھر انسانیت کی ایک جدید تشکیل کی کہ جس میں جامد و متحرک ہر قسم کے بتوں کی فرمانروائی ختم کر دی گئی اور ایک خدائے حکیم و قدیر کے ساتھ انسانیت کو وابستہ کر دیا۔ انسانیت کا فضل و شرف ملک و نسب سے ہٹا کر اللہ کی وابستگی پر رکھا اور تمام انسانوں میں توحیدِ الٰہی کی بنیاد رکھی کہ وہ "احرارِ عرب" اور "کلفتانِ حبش" دونوں مل جل کر بھائی بھائی ہو گئے جس کی وجہ سے انسانیت ہلاکت سے نکل کر کامیابی کے راستہ پر پڑ گئی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا
(تم تمام مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو

وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ
اور جدا جدا مت ہو جاؤ اور اللہ کی نعمت

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً	کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے تو اس
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ	نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی
بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى	اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے
شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ	اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تھے۔
فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ	پس اس نے تمہیں ہلاکت سے بچا لیا
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ	اللہ اسی طرح تم سے اپنی آیتیں بیان کر دیتا
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔	ہے تاکہ تم لوگ ہدایت پر آجاؤ۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے اس "کلمہ جامعہ" کا ذکر فرمایا ہے کہ جس کے ذریعہ اللہ نے انسانیت پر احسان فرمایا اور اس کی عداوتوں کو مٹایا اور دلوں میں الفت پیدا کر دی جس سے اخوت کی بنیاد مستحکم ہو گئی اور اخوت سے پہلے جو خطرناک حالت پیدا ہو گئی تھی اس سے بچا لیا۔

اسی طرح قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی فضیلت تقویٰ پر ہے اور اس کے سوا کسی چیز پر نہیں۔ جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ	لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت
مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ	سے پیدا کیا اور تمہیں شعوب و قبائل پر بنایا

شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	ہے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ	کو پہچان لو اور بے شک اللہ کے ہاں تم
اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ	میں بزرگ وہی ہے جو تم سب سے زیادہ متقی
خَبِيْرٌ	ہو، یقیناً اللہ علم والا، خبردار ہے۔

یہاں صاف صاف اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح فرمادیا کہ "شعوب وقبائل" محض باہمی تعارف کا ذریعہ ہیں اور اللہ کے نزدیک بزرگی و برتری صرف صاحبِ تقویٰ کو حاصل ہے اسلام نے ہر قسم کی قومیتیں خواہ وطنی ہوں یا نسلی ہوں سب کو مٹا کر ایک نئی "بین الاقوامی انقلابی جماعت" پیدا کی ہے جس کا کام قرآن کے انقلابی جہانی نظریہ کو انسانیت کی فلاح کے لیئے رائج کرنا ہے اس لیئے ضروری تھا کہ جاہلیت کے تمام تصورات سے الگ اپنی تعمیر کا نقشہ پیش کیا جائے اب پھر ایک مرتبہ اشعار مذکورہ پڑھو کہ کس طرح .... روحِ ابوجہل آج بھی نوحہ خواں ہے۔ اور اس "مساوات اسلامی" کی حقیقت کے بے نقاب ہونے سے کس طرح آج زر پرست، اور زر پسند انسان گھبرا رہے ہیں۔ اور دنیا کے موجودہ غیر اطمینان بخش دور میں اگر اس "اسلامی مساوات" کو پیش کیا جائے تو کیا دنیا اپنی بیرابی کا سامان اس آبِ حیات کے ذریعہ نہیں کر سکتی؟ اب وقت نہیں ہے کہ اسلامی مساوات، اخوت

اور اس پر قائم ہونے والی اجتماعی فلسفہ و تمدن کی عمارت کو اس وقت تک مؤخر کر دیا جائے جب تک کہ "نسلی مسلمان" سدھر نہ جائے بلکہ اب پھر سے "ہیئت اجتماعیۂ اسلامیہ" کی دعوت عام طور پر دیتے رہنا چاہیئے جن لوگوں کے دلوں میں استعداد و قابلیت ہوگی وہ ادھر کھنچ کر آئینگے، خواہ موجودہ "نسلی مسلمان" ہو یا دوسری "غیر مسلمان قوموں" کے سعید و صالح افراد۔ مگر کتنی افسوسناک ہے یہ حالت کہ وہ جس کے پاس یہ "آبِ حیات" موجود ہے وہ اقوامِ عالم کی امامت کے بجائے غیروں کی امامت میں دوڑا چلا جا رہا ہے، اور شعوری یا غیر شعوری کسی نہ کسی طرح اس کو درست بھی سمجھتا ہے۔ لیکن امید ہے کہ اسلام کا عمومی پیام پھر ایک بار اسی طرح زندگی بخش ثابت ہوگا جس طرح پہلے ہو چکا ہے اور وہ تمام سعید روحیں آملیں گی جن کے اندر اسلامی انقلاب کی تڑپ موجود ہے۔

آئینگے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائیگی

اشتراکیت و ملوکیت

جب زندہ رود کو اس کا رہنما فلک عطارد میں لے جاتا ہے، تو وہاں سید السادات مولانا سید جمال الدین افغانی اور ترکوں کے بہترین سپہ سالار حلیم پاشا کی روحوں سے ملاقاتیں نصیب ہوتی ہیں "رومی" زندہ رود کا تعارف دونوں سے کراتے ہیں، زندہ رود سے حضرت افغانی دنیائے جدید بالخصوص مسلمان ملکوں کے حالات دریافت فرماتے ہیں۔ پھر علامہ افغانی کو جواب دیتے ہیں اور "دین"، "وطن" کا مفہوم سمجھاتے ہیں "اشتراکیت" و "ملوکیت" کے طلسم کا پردہ چاک کرتے ہیں۔

اس کے بعد "زندہ رود" سعید حلیم پاشا سے ہم کلام ہوتا ہے، غازی مرحوم اہل شرق و اہل غرب کے اختلافات اور نفسیاتی رجحانات پر نہایت دل افروز تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ افرنگیوں کا شعلہ "نم خوردہ" ہو چکا ہے ان کی آنکھیں اگرچہ تیز ہیں مگر پہلو میں دل مردہ ہو چکے ہیں۔ کمال اتاترک نے یورپین قوموں کی تقلید و نقالی کر کے جو "تجدد"، کا ثبوت دیا ہے اس کی پوری اصلیت آشکارا کر دی جاتی ہے کہ ترکوں نے جس کو "جدید" سمجھا حقیقت میں وہ ایک بالکل "ضلال قدیم" ہے اس تقلید کے

باعث ترکیہ اپنے مرکزِ اصلی "اتحادِ اسلامی" سے ہٹ گئی ہاں! پھر سے "ملت ترکیہ" کے "تجدد" کی نہیں "تجدید" کی اگر ضرورت ہو تو ان خیر خواہی کی باتوں کو محفوظ رکھو اور سوچو کہ کب تک دوسروں پر تکیہ کرو گے؟

چو مسلماناں اگر داری جگر! — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر!
صد جہانِ تازہ در آیاتِ او — عصرہا پوشیدہ در آیاتِ او
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی بس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است — ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا است
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

اگر تم مسلمانوں کی طرح جگر رکھتے ہو تو تم اپنے ضمیر اور قرآن ان ہی دو چیزوں کو ٹٹول کر دیکھو یعنی اپنے فطری انداز سے غور کرو کہ تم میں اور قرآن میں کیوں لگاؤ نہیں ہے قرآنی ہدایات کے علمی و عملی پہلو کیوں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے کہ تمہاری حیاتِ اجتماعی پر غیر اسلامی نظریات و افکار نہ صرف خارجی طور پر مسلط ہو چکے ہیں بلکہ ذہن و دماغ کی پوری فکری صلاحیت مفقود ہو چکی ہے جو کچھ سوچا جاتا ہے اپنے ضمیر کی روشنی میں نہیں بلکہ دوسروں کے مستعار "فکر" سے سوچا جاتا ہے بس اس کو چھوڑ دو اُس ضمیر سے سوچو جو اسلام کے سانچے میں ڈھلا ہو، پھر قرآن سے وابستہ ہو جاؤ یہ تمہاری زندگی میں کامیابی ہے۔ قرآن کو "اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ"

یا "دستورِ کہن" نہ سمجھ لو اس کی آیتوں میں سینکڑوں نئے نئے جہان آباد ہیں اسکی آیتوں میں بہت سے زمانے پیچیدہ ہیں جن میں اگر ایک "عصرِ قرآنی" بھی پالو تو "عصرِ حاضر" کی کرب و بے چینی اور اجتماعی پریشانی کو رفع کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ تمہارے سینہ میں اگر معنی رسول موجود ہے تو ان حقائق پر غور و خوض کرو۔

مومن کی حقیقت کیا ہے؟

وہ خدائے تعالیٰ کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے اس کا وجود "خلافتِ الٰہیہ" کے قیام کا ضامن ہے ہر دورِ زندگی اس کے لیے ایک لباس کی طرح عارضی چیز ہے جس زمانے میں جو لباس چاہیئے استعمال کرتا ہے یہاں تک کہ ہر دور میں اس کو نئے لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔ "یعنی مومن" کے اندر اتنی لچک ہوتی ہے کہ وہ اپنی ایمانی قوت سے ہر زمانے کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ جب چاہتا ہے زمانیات سے وابستہ ہوتا ہے اور جب چاہتا ہے زمانیات کی چادر اتار کر پھینک دیتا ہے یعنی وہ زمانے پر حکمران ہوتا ہے زمانہ اُس پر حاکم و آمر نہیں بن سکتا۔ اگر ایک زمانہ پرانا ہو جاتا ہے تو چونکہ مومن قرآن سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لیئے ہر دم اس کو قرآنی علوم سے نیا زمانہ ملتا رہتا ہے۔

سیّد جمال الدین افغانی سے گفتگو

اس کے بعد "زندہ رود" سید افغانی سے گفتگو شروع کرتا ہے۔ اور سوال کرتا ہے۔

زورقِ ما خاکیاں بے ناخدا است   کس نداند عالمِ قرآں کجا است

نہ تو ہم خاکدانِ فانی پر رہنے والوں کی کشتی کا کوئی ناخدا ہے۔ اور نہ ہمیں قرآنی عوالم میں سے کسی کی خبر ہے؟ اور کوئی یہ جاننے والا تک نہیں کہ "عالمِ قرآن" ہے کیا؟

اس پر سیّد افغانی "زندہ رود" سے مخاطب ہو کر فرمانے لگتے ہیں اور "عالمِ قرآن کی تشریح کرتے ہیں۔ وہ عالم ابھی تک ہمارے سینوں میں گم ہے اور "قُم" کی انتظار میں ہے اس عالم میں خون و رنگ کا امتیاز نہ ہوگا۔ اس کی شام صبحِ فرنگ سے زیادہ روشن ہوگی اس میں بادشاہوں اور غلاموں کی تفریق ناپید ہوگی اور اس کی وسعت مومن کے دل کی طرح بے پایاں ہوگی۔ وہ عالمِ رعنا ایسا ہوگا کہ اسکا فیضِ یک نظر "جاودانی عمر" میں تخم افگنی کریگا۔ وہ عالم ایک لایزال عالم ہوگا۔ اس کے واردات نو بہ نو ہوں گے اس کے محکم برگ و بار بھی تازہ تازہ ہوں گے اس کا باطن ہر تغیر سے بے غم اور اس کا

ظاہر ہر دم انقلاب ہی انقلاب ہوگا، یہ عالم تم پوچھتے ہو کہ کہاں پوشیدہ ہے۔ سُن لو کہ یہ عالم خود تمہارے اندر پنہاں ہے، آؤ اب اس کے محکمات کی تشریح بھی سن لو۔

(۱) پہلے خلافت آدم کو لو۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اور اس کا وجود اسرارِ عشق میں سے ایک بھید ہے اور کسی قسم کے حدود میں وہ محدود نہیں ہو سکتا اور اس کی پوری حقیقت ؎

حرفِ اِنّی جَاعِلٌ تقدیرِ او از زمین تا آسماں تفسیرِ او

یعنی آدم کی خلافت، اور اس کا مقصد تسخیر کائنات کے ذریعہ عرفان الٰہی ہے "اِنّی جَاعِلٌ" کی شرح کسی قدر اوپر ہو چکی ہے مزید یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ آدم کی حقیقت یہ ہے کہ وہ عالم رنگ و بو میں نہیں سما سکتا البتہ تمام عالم مادی اس میں سما سکتا ہے آدم کا مرتبہ تمام کائنات اور اس کی اشیاء سے برتر ہے اس کا آخر دم "اصل تہذیب" ہے غرض آدم کی حقیقت کے لیئے عشق اور علم دو باتوں کو سمجھ لینا چاہیئے اور زندگی اسی سے عبارت ہے اور خلافتِ آدم کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات کا خالق، مالک اور مربّی خدا تعالیٰ ہی ہے انسان صرف اس کی طرف سے بطور نائب اور خلیفہ کے ان چیزوں میں تصرف کر سکتا ہے

اور وہ بھی صرف انہیں چیزوں میں تصرف کر سکتا ہے جن کی اجازت مالکِ حقیقی نے دے رکھی ہے، اور استعمال بھی مالک کے منشا و مقصد کے خلاف نہ ہونا چاہیئے اگر ایسا نہ ہوا تو "خلیفۃ اللہ" کے بجائے وہ غاصب ہوگا اور اس سے باز پرس کی جائے گی مگر جب تک "خلیفۃ اللہ" کے لیئے احکام الٰہی کی تنفیذ کا موقع نہ ہو اس کی خلافت کا رازِ سربستہ آشکارا نہیں ہو سکتا اس لیئے کہ دوسری چیز "حکومتِ الٰہی" ہے یعنی تمام کائنات اللہ تعالیٰ ہی کی مملوک ہے انسان کو حکومتِ الٰہی کے قیام کے سوا دوسری چیز کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے اور جب انسان اپنی ظاہری و باطنی تربیت کے بعد اس مقصد کے قیام کے لیئے مستعد ہو جاتا ہے تو بندۂ حق بن جاتا ہے اور "مقامیات" سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس میں حریت و آزادی اس درجہ آجاتی ہے کہ وہ نہ تو کسی غیر اللہ کی طاقت کے آگے سر جھکاتا ہے اور نہ یہ پسند کرتا ہے کہ کوئی اس کا غلام بن کر اس کے آگے سرِ نیاز خم کرے بلکہ مساوات انسانی کا دنیا میں عملی پیغام پیش کر دیتا ہے ساری زمین اسکا ملک اور اس کے ملک کا "آئین خداداد" ہوتا ہے اس کی رسم و راہ اسکا دین و آئین اسکا زشت و خوب سب کچھ خدائے تعالیٰ ہی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اور اس میں سے وہ "عقلِ خود بین" نکل جاتی

ہے جو صرف اپنا ہی فائدہ دیکھتی ہے دوسروں کے آرام کا کچھ خیال نہیں کرتی۔ برخلاف اس کے اس مردِ حق کا آئین خداداد یعنی "وحیِ حق" (قرآن عزیز) تمام نوعِ انسانی کے سود و بہبود کا دیکھنے والا ہوتا ہے اور تمام انسانوں کے فوائد بہ حیثیتِ مجموعی اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں اور "مردِ حق" اس آئینِ خداداد سے وابستہ ہو کر صلح ہو یا جنگ ہر حال میں عادل ہوتا ہے اور اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ اس کے سامنے رہتا ہے اور عین حالتِ جنگ میں بھی اس کو حکم ہے کہ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ اب ذرا اس آئینِ خداداد "قرآن" کے مقابلہ میں انسانی ملوک و سلاطین کے آئین کا موازنہ کرو ؎

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک ده خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

آئینِ ملوکیت کی وجہ سے انسانیت طبقوں میں بٹ جاتی ہے اور ایک طبقہ زمینداروں کا پیدا ہو جاتا ہے جو جائز و ناجائز اموال کھا کھا کر موٹا تازہ ہوتا ہے تو دوسرا طبقہ نادار کسانوں کا ہے جو صرف ایک "دھواں" بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ انسانی طبقات کی غیر فطری تقسیمِ ملوکیت کے غیر معتدل نظام کا نتیجہ ہے اگرچہ یہی ملوکیت ذرا ترقی پانے پاتے اپنی ظاہری شکل میں بہت کچھ طمطراق پیدا کرتی ہے اور "دستورِ جمہور" کا جو شکن نام اس کو مل جاتا ہے اور حقیقت میں "شاطرانِ ملوکیت" ہر

زمانہ میں اپنی عجیب عجیب کمیں گاہیں بنا لیتے ہیں اور یہ سب کچھ جمہوریت ایک "بستر دلبراں" ہے کہ جس کی تہہ میں "انسانیت" متاعِ سوگراں بن جاتی ہے اس جمہوریت نے بھی رنگ بہ رنگ کے چولے بدلے ہیں مگر اس سے عبرت کے سوائے کچھ حاصل نہیں بلکہ اس کی تقلید سے آزاد ہو جانا ہی سب سے بڑھ کر دنیائے انسانی کے لئے آزادی ہے اور اس نام نہاد جمہوریت سے آزادی دامنِ قرآن سے وابستگی کے بغیر ناممکن ہے ۔

اے بہ تقلیدش اسیر، آزاد شو ۔ دامنِ قرآں بگیر، آزاد شو

افسوس ہے ان لوگوں پر جو دامنِ قرآن، سے وابستگی کے بغیر آزادی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ خواہ ہندوستانی جمہور کی مغربیت نواز جمہوریت والی آزادی ہو یا "مسلمان" نامی قوم کی قومی جمہوریت ہو جس میں دامنِ قرآنی سے کوئی لگاؤ نہ ہو، آپ اسکا خواہ کوئی نام رکھ لیں جب تک اس کی بنیاد قرآن کے نظریۂ سیاسی پر نہ ہوگی وہ مسلمانوں کے لیے توان سے مرض کا علاج نہیں! البتہ ممکن ہے چند سرمایہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو جائے جو "اسلامی حکومت" پکار رہے ہیں ان کو سب سے پہلے اس کی جامع تشکیل کر دینی چاہیئے پھر اس کے قیام کے لیئے وہی ذرائع اختیار کرنے چاہئیں جس کے نتیجہ لازمہ کے طور پر اسلامی

حکومت وجود میں آجائے ورنہ یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

(۳) ارض ملک خدا ہے یعنی جس طرح پہلے جمہوریت و ملوکیت کی پردہ دری کی گئی ہے اور کسانوں اور ناداروں کی حمایت میں آواز اُٹھائی گئی ہے ٹھیک اسی طرح پر یہاں زمین کا مسئلہ حل کر دیا جاتا ہے۔ جو موجودہ دور کی سب سے بڑی ہنگامہ خیز تحریک اشتراکیت کی جان ہے یعنی زمیندار اور کسان کی کش مکش دور کرنے کے لیئے اشتراکی زاویۂ نگاہ غیر مفید ہے بلکہ قرآنی زاویۂ نگاہ پیش نظر ہونا چاہیئے۔

قرآنِ عزیز نے زمین اور زمین کی تمام چیزوں کو "متاع" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے یعنی یہ تمہارے استعمال کی چیز ہے اس کو تم استعمال کر سکتے ہو اور ملکیت تو صرف خدائے واحد ہی کی ہے تمہارے نفع کے لیئے اس نے اپنی ملکیت کی تمہیں اجازت دی ہے۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نہ گفت　　ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دِہ خدایا! انکتہ از من بگیر　　رزق و گور از او بگیر او را بگیر

زمین کو حق تعالیٰ نے جب صرف متاع فرمایا ہے تو اس کو برتنا ضرور چاہیئے مگر اس پر "ملکیت" قائم کر کے دوسروں کے حقوق غصب کرنے کسی طرح روا نہیں۔ البتہ اپنا رزق اور اپنی "قبر" دو ضرورتوں کی تکمیل اس زمین سے کی جا سکتی ہے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

یہاں اشتراکیت اور اسلام کا جوہری فرق معلوم کیا جاسکتا ہے اشتراکیت مساوات انسان کی بنیاد صرف "مادیت خالصہ" پر رکھتی ہے اور ایک ظلم کو رفع کرکے دوسرے ظلم کو اس کے قائم مقام بنا دیتی ہے بہ خلاف اس کے قرآنی نظریہ ہے جو انسانیت کو ایک بلند اجتماعی، مادی اور مابعد الطبعیاتی۔ نصب العین عطا کرتا ہے اور اس کی نگاہ میں پوری کائنات مادی اور اس کا نظام کون و فساد ایک برتر و اعلیٰ ہستی کے ساتھ وابستہ قرار دیتا ہے اور اس طرح زمین داروں کو کسانوں پر ظلم کرنے سے روک دیتا ہے اس جوہری فرق کے بعد ان لوگوں کی غلط کاری واضح ہوگئی جو اسلامیات کو اشتراکیت پر چسپاں کرتے ہیں اور اپنی جگہ خوش ہو رہے ہیں کہ "اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ"، حالانکہ انہوں نے دو متضاد چیزوں کو ایک کرکے فساد کر دیا ہے اور افسوس کہ ان کو اس کا شعور و احساس تک نہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

زمین کے متعلق قرآنی نظریہ واضح ہو چکا۔ جو اس حقیقت سے انکار کرے گا وہ کفر کی حقیقت سے ہم کنار ہوگا، اس واسطے کہ کفر "وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا" کے سوائے کچھ نہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور اشتراکی بھی، افسوس ہے کہ ایک

عجیب تضاد میں مبتلا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اشتراکیت محض کسی جزوی نظامِ انسانی کا نام ہے یا ایک "کلی اجتماعی نظام" کا اگر پہلی صورت ہوتی تو خیر ایک حد تک لوگوں کو معذور سمجھا جاتا مگر واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسری صورت ہے یعنی اشتراکی حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ دنیائے انسانیت کی فلاح و صلاح اور اس کی کامیابی کے لیئے ایک جامع و مکمل نظام "اشتراکیت" ہے جو انسانیت کی ہیئۃ اجماعیۃ کی ایک خاص تشکیل کوتا ہے۔ اس میں نہ صرف اقتصادی نظام ہے بلکہ اخلاقی سیاسی اور عمرانی پروگرام بھی ہے اور تمام اجزاء میں پورا پورا منطقی ربط و تعلق ہے صرف اس کو اقتصادی نظام قرار دینا اور "مذہب" سے غیر متصادم سمجھنا نظر و فکر کی ایسی پراگندگی ہے کہ جس کا علاج بہ ظاہر مشکل ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت کا نقطۂ آغاز و کائنات کے سراسر مادی تصوّر اور اس کے منظہرِ اتم "شکم پروری" سے شروع ہوتا ہے۔ اور اختتام ایک غیر دینی جمہوری انسانی مساوات پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ صاف کہنا پڑتا ہے۔

باطن الارض للہ ظاہر است ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است

اب سمجھ میں آگیا کہ کافر کا لفظ ٹھیک اپنے معنی میں بولا گیا جو اسلام کے چند رسوم کی پابندی کے ساتھ ساتھ کفر کی طاقتوں اور ان کے سیاسی

نظریوں سے اتحاد ذہنی یا خارجی رکھتے ہیں وہ حقیقت میں "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام" اور "ادخلوفی السلم کافۃ" کی حقیقت سے بے بہرہ ہیں اور قرآن کی زبان میں "وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ" کے مصداق ہیں اسلام کے فلسفۂ اقتصاد کا بعض نظریات میں بظاہر اشتراکیت سے مشابہ ہوجانا ہرگز اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اسلام اور اشتراکیت باہم دگر ہم آہنگ ہیں اور جس طرح ملوکیت پسندانہ ذہنیت رکھنے والوں نے اسلام کو اپنے معبودان باطلہ اور الٰہہ کاذبہ کی مرضیات کے مطابق ڈھالا ہے اور جب سے آقایانِ فرنگ کا مفاد جمہوریت کی چیخ و پکار میں مرکوز ہوگیا ہے تو اب اسلام کی جمہوریت کا بھی راگ خوب الاپا جارہا ہے اسی طرح "اشتراکیت" کو ایک ہنگامہ خیز تحریکِ انقلاب سمجھ کر اسلام کو اس سے ہم آہنگ کردینے کی غلط روش اختیار کی گئی ہے، ان سب سے اقبال کہتے ہیں۔

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل ہست　　　اے زخود رفتہ تہی شو زنوائے دگراں

الحاصل اشتراکیت کا نظریہ زمین کے متعلق بالکل غلط اور غیر فطری امر ہے مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم مادی اشیاء اور اس کی طبعی قدروں سے ناواقف ہیں اور مادیات سے مجرد ہوجانے کا جوگیانہ مشورہ دے رہے ہیں۔

اسی لیئے سیّد افغانی نظریہ قرآنی "الارض للہ" کو واضح فرماتے ہوئے صاف کہہ رہے ہیں کہ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ انسان کو اس "کارخ و کوے" سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے بلکہ جہان رنگ و بو کو اپنی ہی دولت سمجھو مگر آذری طریقہ کو چھوڑ کر اپنی مراد پر یعنی مرادِ قرآنی پر ایک "جہانِ نو" ضرور آباد کرو چونکہ دل "حریمِ قرآنی" ہے اس کو کسی غیر کے حوالہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے اور اس کی ضرورت ہے کہ "لا الٰہ" کو ازبر کر لیا جائے تاکہ ایک عالم کو اپنے اندر گم کر دیا جائے تاکہ "فقرِ سلطانی" اور "فقرِ رہبانی" کا فرق ظاہر ہو جائے۔ چوتھی چیز جس کو سید افغانی محکماتِ قرآنی سے تعبیر فرما رہے ہیں وہ "خیرِ کثیر" ہے

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

یہاں "وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا" کی طرف راہنمائی کی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حکمت خیرِ کثیر ہے اس کو ہر طرح پا لینا چاہیئے وہ ہمارا ہی حق ہے آپ نے پہلے خلافتِ آدم حکومتِ الٰہی دونوں کی اجمالی حقیقت معلوم کر لی ہے "خیرِ کثیر" کو سمجھ لینا کچھ دشوار نہیں وہ تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ضروریاتِ زندگی کے لیئے کائنات میں فراہم کر دی ہیں وہ سب اس کے حق میں خیرِ کثیر ہیں اور تمام تکوینیات کی تحقیق و تدقیق اس کو خالقِ کائنات سے

ہی ہم کنار کرتی جائے گی اور جو حکمت ان چیزوں میں ممد و معاون ہے وہی خیرِ کثیر ہے اور جب یہ حاصل ہو جائے گی تو پھر عجیب کیفیت ہوگی۔

چشمِ او بر واردات کائنات تا بہ بیند محکماتِ کائنات

کائنات کی محکمات نظر آنے لگیں گی اور سُبْحَانَكَ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ کی زمزمہ سنجیوں سے زبان شاد کام اور روح مسرور رہوگی مگر کائنات اور اس کے واردات کی تحلیل کی دو بنیادیں ہوں گی ایک تو وجودِ باری اور اس کی وحدت کے انکار پر دوسری اس کے اقرار اور لوازم اقرار پر۔ پہلی صورت میں کافرانہ انداز ہوگا جس میں اپنی بدقسمتی سے اس وقت مادہ پرستانہ ذہنیت رکھنے والا یورپ عام طور پر مبتلا ہے اور اس کو تمام قوموں میں دماغی راہنمائی کا وہ مقام حاصل ہے کہ اس کا ہر "انکشاف" دنیائے جدید کے لیئے وحی کا حکم رکھتا ہے۔ اے کاش مسلمان قرآنی علوم میں سے "وعلم تذکیر بآلاء اللہ" کی حقیقت کو اس دور میں معلوم کرتے اور ایجادات و اختراعات کی اہمیت کو سمجھتے! اور قرآن کے "امور کونیہ" پر بھی اپنی کوششیں صرف کرتے تو انہیں یہ حقیقت بے نقاب ہو کر نظر آتی غرض حکمت اور سائنس اور اسرارِ کائنات کی تحقیق و تدقیق کی بنیاد "دین" کے نقطۂ آغاز سے ہو تو "پیغمبرانہ" کام ہے ورنہ سوائے کافری کے کچھ

بھی نہیں۔

دل اگر بندد بر حق پیغمبری است　　ورز حق بیگانہ گردد کافری است

اگر حکمت اس معیار پر نہ ہو تو خیرِ کثیر کی بجائے "شرِ کثیر" بنجاتی ہے

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است　　نورِ او تاریکی بحر و بر است

اس چیز کے سمجھنے کے لیئے اس خونی ڈرامہ کا مطالعہ کافی ہے جو اس وقت یورپ کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے کہ کس طرح "سینۂ افرنگ" کے لیے "بے سوزی" مہیا کی گئی ہے اور یہی چیز ہے جس کے باعث ابلیس کو اپنی کارفرمائیوں کا خوب موقع مل جاتا ہے۔ مگر ابلیس اور اس کی کارفرما قوتوں کا ختم کر دینا بھی غایۃ درجہ مشکل ہے یعنی انسان کے اندر خود قوتِ بھیمیہ موجود ہے جو اس کا مظہرِ اتم ہے تو اس "ابلیس" کو بالکل ختم کر دینا تو نہیں ہو سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ابلیسی قوت یا بہیمیت کو "مسلمان" کرے یعنی اس درجہ اصلاح یافتہ کر دے کہ وہ مقیّد بن جائے اور اس کی مضرّت رسانی جاتی رہے۔

خوش تر آں باشد مسلمانش کنی　　کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

یعنی ابلیسی قوتوں کو قرآن کی شمشیر سے کشتہ بنا دو تو پھر وہ مسلمان ہو جائیں گی اور اسی کے ساتھ ساتھ ضرورت ہے "علم با عشق" کی جو "دل ہو ہتیوں" کی نشانی ہے نہ کہ "علم بے عشق" جو طاغوتیوں کی علامت

جلی ہے جس کے بعد "بولہب" کو بھی "حیدرِ کرار" کہا جا سکتا ہے۔

اس محکماتِ قرآنی کی شرح کو سُن کر "زندہ رود" چلاّ اٹھتا ہے کہ

محکماتش وا نمودی از کتاب ہست آں عالم ہنوز اندر حجاب

اگرچہ آپ نے قرآن کے محکمات کو ہویدا کر دیا ہے مگر اب تک وہ عالم حجاب ہی میں ہے حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھا کر صاف چہرہ کشائی کیوں نہیں کی جاتی اور وہ عالم ہمارے ضمیر سے کیوں نمودار نہیں ہو جاتا؟ اس عالمِ قرآن کے بجائے ہمارے سامنے ایک ایسا فرسودہ عالم ہے جس کی خاک میں ملتِ اسلامیہ آسودہ ہے۔ تمام مسلمانوں کے سینوں سے "دسوز" جاتا رہا کیا ہم یہ سمجھیں کہ مسلمان مر گئے یا قرآن مر گیا! قرآن تو بہر حال حیّ و قیّوم کا کلام ہے اور "انّا لہٗ لحافظون" کا وعدہ اس کی حفاظت کا ضامن ہے البتہ مسلمان قومیں مر چکی ہیں گو بہ ظاہر ان میں کچھ زندگی نظر آ رہی ہے۔

پرنس سعید حلیم پاشا سے گفتگو

سید افغانی کے بعد پرنس سعید حلیم پاشا ترکی دنیا کی داستان غم سناتے ہیں جو کم و بیش تمام مسلمانوں کو معلوم ہے دین حق کا فری سے بھی زیادہ رسوا ہو گیا ہے چونکہ "علمائے سو" اور ملاؤں نے کفر گری شروع کر رکھی ہے ان لوگوں کی

قرآن فروشی سے روح الامین کو خود میں نے بھی نالاں پایا ہے۔

از شکر خندہائے آں قرآں فروش / دیدہ ام روح الامیں را در خروش

زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ / نزدِ او اُمّ الکتاب افسانۂ

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی / آسمانش تیرہ از بے کوکبی

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد / ملّت از قال و اقوالش فرد فرد

ان اشعار میں "علمائے اشرار" کی پوری حقیقت کھول دی گئی ہے۔ یعنی ان کو کائناتِ علوی سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی قرآن عزیز ان کے نزدیک ایک افسانہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ دینِ محمدیؐ کی حکمت سے وہ بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ان کا آسمان بے کوکبی سے تیرہ و تاریک ہوتا ہے ان کی کم نگاہی کور ذوقی ہرزہ گردی اور ان کے "حال و اقوال" سے ملّت اسلامیہ پارہ پارہ ہو گئی ہے۔

"علمائے سو" اور "علمائے خیر" کی اگر تفصیل مطلوب ہو تو احیاء العلوم امام غزالیؒ کی پڑھو یا تذکرہ مولانا ابوالکلام "(وفقہ اللہ لما یحب ویرضیٰ)" میں اکبری دور کے "علمائے سو" کے حالات کا مطالعہ کرو یا کم از کم اپنے دور کے ان علمائے سو کو دیکھو جو اب تک عقائد میں غیر ضروری باتوں پر اصرار کر رہے ہیں رسول اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب ثابت کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور سینکڑوں ایسی باتیں گھڑ رکھی ہیں۔ جن کا کوئی ثبوت

اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے نہیں۔ بجائے قرآن کی تعلیم و تبلیغ کے وہ لوگ بے معنی جھگڑوں میں مبتلا ہیں اور اس طرح ان غیر حقیقی مسائل میں اُلجھ کر قرآن کی تعلیمات کو پس پشت ڈال رہے ہیں "نزد او اُم الکتاب افسانہ" اس لیئے ایسے "علماء سو" اور ان کی درسگاہوں کا وجود سب کچھ بے کار ہیں اس واسطے کہ ان کو اسلامی خدمت اور قرآنی تبلیغ کا اہتمام ہی نہیں ہے اور ان کی مثال "کورِ مادر زاد" اور "نورِ آفتاب" کی سی ہے۔

مکتب و ملاّ و اسرارِ کتاب   کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

اب ذرا مردِ حق کی بھی کچھ علامتیں سُن لو جو علمائے خیار میں سے ہوتا ہے کہ وہ جہاں چارسو کی جان ہوتا ہے اس کے افکار مومن کے لیئے اسباب زندگی ہوتے ہیں اس کی ہر ہر سانس ملّتِ اسلامیہ کے لیے ثبات کا سبب بنجاتی ہے مختصر یہ کہ قرآنِ عظیم کی حفاظت اس کا آئین اور حق بات کا کھلم کھلا کہہ دینا ہی اس کا دین ہوتا ہے۔

حفظِ قرآنِ عظیم آئینِ اوست   حرفِ حق را فاش گفتن دینِ اوست

یعنی قرآنِ عظیم کے علم و عمل کی حفاظت ہی اس کی زندگی کا مقصدِ وحید بن جاتا ہے اور ہر وقت حق و صداقت ہی کے لیئے اس کی زبان وقف ہو جاتی ہے اس کی طرف حدیثِ نبوی میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک طبقہ میری امت میں ضرور ایسا رہے گا جو حق پر ثابت قدم رہے گا۔

اور اس کا کام اسلام کو ہر دور میں "جاہلیت" سے ممتاز کر کے پیش کرتے رہنا ہو گا۔

ذرا اس مردِ حق کے اوصافِ جمیلہ بھی سُن لیجئے۔

مردِ حق از کس نہ گیرد رنگ و بو — مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر — ہر زماں او را چوں حق شانے دگر
رازہا با مردِ مومن باز گوئے — شرح رمزِ "کُلَّ یَوْمٍ" باز گوئے

مردِ حق کا کام حق سے ہی رنگ و بو حاصل کرنا ہے وہ کسی دوسرے سے اثر پذیر نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کی شیئون و تجلیات کا ہر دم مظہر بن جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر وقت اس کی ایک نئی شان ہوتی ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ کی صفت "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ" کا نمونہ ہوتا ہے۔ اور "تخلّق باخلاق اللہ" کے مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے۔" پھر سید افغانی سلسلۂ کلام شروع کرتے ہیں کہ تم کو حدیثِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم یاد ہو تو سمجھ سکتے ہو کہ "دینِ حق" پھر دنیا میں غریب ہو گیا ہے یعنی جس طرح اسلام ابتدائے بعثتِ نبوی میں "غربت" کی حالت میں شروع ہوا اسی طرح آج دین پر غربت طاری ہو گئی ہے ذرا "غربت" کا مفہوم بھی ذہن نشین کر لو اور سمجھ لو کہ ہر زمانہ کی "غربت" الگ الگ ہوتی ہے اگر تم اس دور کی "غربتِ دینِ حق" کو صحیح طور پر معلوم کر لو گے "تو عصرِ نو" کو دام میں

لا سکتے ہو مگر افسوس ہے کہ آج مشرق و مغرب دونوں پیچ و تاب میں ہیں کوئی بھی اسرارِ قرآن سے واقف نہیں اگرچہ روسیوں نے "نقشِ نوی کی طرح ڈال دی ہے مگر "آب و نان" ہی کے دام میں اُلجھ کر رہ گئے اور دین کو فراموش کر دیا ہے میری طرف سے ملّتِ روسیہ کو یہ پیغام پہنچا دو۔

منزل و مقصودِ قرآن دیگر است　　رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست　　مصطفےٰ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآن بر نخورد　　در ایاغِ اُو نہ مے دیدم نہ دُرد

یعنی آج کے مسلمان کو دیکھ کر دین حق کو نہ سمجھ لیں کیوں کہ آج کے مسلمان اور اس کی منزلِ مقصود قرآن سے علیحدہ ہے اور قرآن کے علاوہ ہر دوسری چیز مسلمان کا رسم و آئین بن چکی ہے آج کے مسلمان کے دل میں وہ محبت نبوی کی آتشِ سوزاں نہیں ہے جس کے باعث آج کا بندۂ مومن قرآن کے ثمرات سے محروم ہے اسی لئے بالکل تہی پیمانہ بن گیا ہے۔ یہی مومن ہے جس نے قیصر و کسریٰ کے طلسم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا مگر افسوس کہ خود ہی پھر تخت ملوکیّت پر بیٹھ گیا یہاں تک کہ جوں جوں اس کی سلطنت قوی ہوتی گئی دین کی گرفت ڈھیلی ہوتی رہی اور ملوکیت کے خدوخال نمایاں ہوتے گئے اور خلافت اسلامیہ نے "منہاج نبوت"

سے ہٹ کر "ملک عضوض" کی شکل اختیار کرلی۔ یہی وجہ ہے کہ ملوکیت نے زاویۂ نگاہ، عقل و ہوش اور رسم و راہ سب ہی کچھ بدل دیا ہے اب اے ملّت روسیہ! تو نے دستورِ کہن سے دل برداشتہ ہو کر ایک "طرحِ دیگر" ڈالی ہے اور قیصریت کی ہڈیاں چُور چُور کر دی ہیں تو تجھے چاہیئے کہ اپنے ضمیر میں نورانیّت بھی پیدا کرلے اور ہماری سرگذشت سے عبرت حاصل کرے اب تجھے اس "لات و ہبل" قیصریت و کسرائیت" ملوکیت سرمایہ داری کے بتوں کی طرف دوبارہ متوجہ نہ ہونا چاہیئے اب اس "دنیائے پیر" کو ایک ایسی ملّت کی ضرورت ہے "جو بشیر و نذیر" دونوں صفتوں سے متصف ہو فرنگ کے آئین اور دین دونوں پرانی چیزیں ہو چکی ہیں اب "دیرِ کہن" کی طرف نہ جا! ہاں تیرے کرنے کا کام صرف اتنا ہے کہ جہاں تو نے خداوندانِ کہن کا کام تمام کرکے ایک اہم خدمت انجام دی ہے محض اس شکست و ریخت پر ہی بھروسہ نہ کرلے بلکہ اس کے بعد تعمیرِ نو کی بھی ضرورت ہے اس لیئے تجھ کو "لا" سے "الّا" کی طرف آ جانا چاہیئے تاکہ تو نفی سے گذر کر راہِ اثبات کو حاصل کرلے اور زندۂ جاوید ہو جائے اگرچہ تو ایک "نظامِ عالم" کی تڑپ ضرور رکھتی ہے مگر افسوس ہے کہ اس کے لیئے کسی "اساسِ محکم" کی تلاش نہیں ہے؛ اب سُن ہم بتاتے ہیں کہ وُہ "اساسِ محکم" کیا ہے،

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

اگر تو نے اے ملّت روسیہ! داستانِ کہن کو دھو دیا ہے اور

دماغ سے محو کر دیا ہے تو اپنی قوتِ فکریہ کو قرآن سے روشن کرلے، یہی وہ کتاب ہے جس نے سیہ فام دنیا کو یدِ بیضا دے کر "لا قیصر و لا کسریٰ" کا مژدہ سنایا تھا۔ اگر اہل مغرب کے مکر سے آگاہی حاصل ہو تو "روبہی" چھوڑ اور "شیری" اختیار کر اور "روبہی" "شیری" کا فرق کیا ہے؟

جزبہ قرآں ضیغمی روباہی است　　فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر　　فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

قرآن کے بغیر اگر انسان کو ضیغمی اور شیری مل جائے تو حقیقت میں روباہی اور مکر و فریب ہی کا ایک مظاہرہ ہوگا فقرِ قرآنی کو فقرِ رہبانی نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ وہ شاہنشاہی کی اصل و بنیاد ہے اور "فقرِ قرآنی" نہ جوگیانہ طرزِ زندگی ہے اور نہ اس کی ریاضتیں اور مجاہدے اتنے دشوار ہیں اور نہ وہ محض فلسفیانہ کاوشوں کی تصوری دنیا ہے جو کبھی میدانِ عمل میں شرمندۂ تشکیل نہ ہو سکے بلکہ قرآن عزیز نے جو فقر پیش کیا ہے وہ شاہنشہی کی اصل ہے چونکہ اسکی حقیقت نہ محض فکر ہے نہ محض ذکر بلکہ ذکر و فکر کا اختلاط ہے۔ یہاں "ذکر اور فکر" دو تعبیریں بلد سمجھنے کے قابل ہیں علامہ اقبال کی اصطلاح میں ذکر سے مراد عملی پہلو اور فکر سے مراد علمی پہلو ہے یعنی جب تک انسان دونوں علمی و عملی قوتوں کا جامع نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی زندگی قرآنی منشا کے مطابق تشکیل نہیں پاسکتی پس ضرورت ہے کہ

"ذہنی آزادی" پہلے حاصل کی جائے تاکہ خارجی آزادی حاصل ہو اور جب یہ بات حاصل ہوگی تو فقرِ قرآنی سے انسان ہمکنار ہو کر دنیا کی حکمرانی اور خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے گا جو لوگ سیاسی آزادی کا خواب دیکھ رہے ہیں انکو پہلے ایمانیات اور عملیات دونوں میں قرآنی ہدایات کا پابند ہو جانا چاہیئے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا۔

اللہ تم میں سے ایمان اور نیک عمل سے آراستہ ہونے والوں سے وعدہ فرماتا ہے کہ وہ تمہیں زمین کی خلافت عطا فرمائے گا جس طرح تم سے پہلے لوگوں کو "خلیفۃ الارض" بنایا تھا تاکہ ان کے لئے انکے پسندیدہ دین پر پورا پورا قابو ہو جائے اور اللہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

فقرِ قرآنی کی حقیقت کی تشریح کر چکنے کے بعد قرآن اور اس کے پیغام کی ایک دل آویز تفسیر کی جاتی ہے۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندہ بے ساز و برگ

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن
کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ | آدمی درندہ بے دندان و چنگ
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست | ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا است
بندۂ مومن امیں حق مالک است | غیرِ حق ہر شئے کہ بینی ہالک است
رایتِ حق از ملوک آمد نگوں | قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں
آب و نانِ ماست از یک مائدہ | دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

ان اشعار میں حقائق و معارف کے دریا بہا دیئے ہیں ضروری ہے کہ مختصر سی شرح کر دی جائے۔ قرآن کیا ہے؟ تمام جابرانہ قوتوں، غیر فطری بندشوں اور ظالمانہ سرمایہ دار طبقوں کو موت کا پیغام ہے اور کمزوروں، مزدوروں، مفلسوں اور تمام غریبوں کے لیئے دستگیری کرنے والا ہے اور قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ بھلائی اور نیکی اپنی محبوب چیزیں خرچ کرنے ہی میں مضمر ہے، ربا اور سود خواری سے سوائے فتنوں کے اور کیا ہو سکتا ہے اسی واسطے کہ اس بدترین ذریعہ سے گو شخصی طور پر ثروت کے آثار رہتے ہیں مگر اجتماعی طور پر برابر فقر و مسکنت چھائی ہوئی رہتی ہے، برخلاف اس کے جس قوم میں اسلامی طرز پر "اقتصادی نظام" کی زندگی ہوگی اور انسانوں کو ضرورت پر قرضۂ حسنہ ملتا رہے گا وہاں حقیقی طور پر لذت حاصل ہوگی اور طبقاتی کشمکش کا خاتمہ ہو جائیگا اور سود خوار انسانوں کی حالت ایک درندہ کی سی ہو جاتی ہے کہ اپنے

قرضداروں کو ہر طرح پھاڑ کھانے کے لیئے تیار رہتا ہے اور اس کرختگی اور شدت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی افتادِ طبیعت بالکل درشت ہو جاتی ہے اور اس میں سے روحانی نور رخصت ہو کر اسکی جان نیرو تاریک بنجاتی ہے یہاں تک تو "سرمایہ دارانہ نظام" پر تنقید فرمائی گئی، اب آگے ذرا "اسلامی نظام" کی چند خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے پہلے بھی گذر چکا ہے کہ قرآنِ عزیز نے زمین کو انسان کے لیئے "متاعا لکم" فرمایا ہے اور یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کہ زمین کا مالک حقیقی زمیندار ہی ہے اس کو ہر طرح کسان پر جبر و زبردستی کا حق ہوتا ہے۔ پھر اس کے مقابلہ میں اشتراکی نظریہ کہ سب کچھ زمین کی ملکیت کا اختیار مساوی طور پر انسان کو حاصل ہونا چاہیئے، غرض ان دونوں متضاد نظریوں کے درمیان اسلام نے ایک اعتدالی صورت پیدا کر دی اور فیصلہ کر دیا کہ زمین، سرمایہ اور کائنات کی ہر چیز اور خود انسان بھی اپنی ذات کا آپ مالک نہیں بلکہ تمام اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں البتہ مالکِ حقیقی نے انسان کو اپنی مہربانی سے تصرف کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت دی ہے پھر اس کے بعد ملوکیت کے پردے چاک کر دیئے جاتے ہیں کہ ملوکیت کیا ہے اسکی شوکت و حکومت سے حق کا پرچم سرنگوں ہونے لگتا ہے، تمام انسانی آبادیاں برباد ہو جاتی ہیں اور ایک "جادوگری" ہوتی ہے جس سے اقوام غالب کمزوروں کو فنا کر دیتی ہے

قرآن عزیز نے خاص طور پر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً	بے شک "ملوک" جب کسی آبادی
اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ	میں داخل ہو جاتے ہیں تو اس کو بگاڑ دیتے
اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ	ہیں اور وہاں کے عزت مندوں کو ذلیل
يَفْعَلُوْنَ۔	کرتے ہیں اور ایسا ہی کرتے رہتے ہیں۔

پھر انسانی مساوات کی حقیقت اس طرح سمجھائی جاتی ہے کہ تمام انسان جب زمین ہی سے پیدا ہوئے ہیں اور اسکی غذائیں کھاتے ہیں تو گویا "نفسِ واحد" کی طرح ہیں ان میں افتراق اور پراگندگی پیدا کرنا مناسب نہیں۔ چاہیئے کہ تمام انسان ایک ہی خدائے واحد کے پرستار ہو کر وطن، نسل، رنگ و بو کے تمام بتوں کو توڑ ڈالیں۔ زندگی اسی میں مضمر ہے۔

ذرا اور سُنیئے قرآنی پیغام کیا ہے؟ اور اس نے دنیائے انسانی میں اپنے انقلابی پروگرام کے ذریعہ کیا تحریک اٹھائی ہے۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست	نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است	ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

یعنی جب قرآنی علوم اور ان کے عملی نتائج کا دنیا نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا اور صفحۂ ہستی پر قرآن کے نقش و نگار بھرنے لگے تو عالم پاپائیت کا افسوں باطل ہو گیا اس قرآنی انقلاب کو دیکھ کر صاف کہہ دینا پڑتا ہے

کہ اس کے باعث دنیا کی کایا پلٹ گئی اور زیادہ کیا بتایا جائے اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنِ عزیز ایک زندہ پایندہ اور ناطق کتاب ہے اور حق تعالیٰ کی طرح "پیدا" اور "پنہاں" ہے۔ مشرق و مغرب کی تقدیریں اس میں پوشیدہ ہیں کاش اس کا خیال پیدا ہو جائے دورِ حاضر کے مسلمان کو پیغام یہ ہے کہ وہ اب میدانِ عمل میں سرگرمِ کار ہو جائے سر کو ہتھیلی پر رکھکر دنیا کی "بساطِ سیاست" پر نمودار ہو جائے اور قرآنِ عزیز کا اجتماعی پروگرام دنیا کے آگے رکھدے اور قرآنی تعلیم "یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ" (کیا خرچ کیا جائے، لوگ دریافت کرتے ہیں، صاف کہہ دو کہ حاجت سے زیادہ جو ہو خرچ کر دو) کو دنیا کے گوشِ ہوش تک پہنچا دیا جائے۔ پھر مسلمان کا اصلی کام یاد دلاتے ہیں۔

آفریدی شرع و آئینِ دگر ۔۔۔ اندکے با نورِ قرآنش نگر
از بم و زیرِ حیات آگہ شوی ۔۔۔ ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی

تم نے ایک نئی شریعت نیا آئین اگرچہ گھڑ لیا ہے مگر ذرا قرآنی نورِ بصیرت کی روشنی میں اس پر تنقیدی نظر ڈالو تو تم کو معلوم ہوگا کہ تم زندگی کے زیر و بم سے واقف ہو چکے ہو اور تقدیرِ حیات تم پر ظاہر ہو گئی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے موجودہ ماحول پر کس قدر عمدہ بات کہی ہے۔

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است　　سازِ قرآں را نوا ہا باقی است

ہم مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نہ تو وہ شرابِ قرآنی ہے اور نہ کوئی ایسا ساقی ہے جس سے ہر دم قرآنی شراب ملتی رہے اگرچہ قرآنی علوم کی تدوین و ترتیب اس کی تفسیر و تشریح میں مسلمانوں نے کافی کاوشیں اُٹھائی ہیں تاہم ابھی تک اس کے بے شمار گوشے باقی ہیں اور جوں جوں انسانی فہم و عقل ترقی کرتے جائینگے۔ قرآنی نغمے انسان کو مسرور کرتے جائینگے۔ ایک حدیثِ نبوی میں وارد ہے کہ "قرآنی عجائبات" کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں" سچ ہے اللہ تعالیٰ نے بھی صاف فرمادیا ہے۔ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (کہف)

اس کے بعد بتاتے ہیں کہ قرآن (ذکرِ حق) کے لیے کسی قوم کی کسی زمانہ اور کسی جگہ کی کوئی احتیاج نہیں ہے اگر اس کو ایک قوم چھوڑ دے گی تو دوسری قوم کے حوالے کر دیا جائے گا اب مسلمانوں کی قرآن سے بے پروائی اور اس کے بجائے تقلید و ظن کی پیروی سے میری روح لرزتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موجودہ مسلمانوں کو پوری طرح محروم کر کے دوسری کسی قوم کو یہ دولتِ گراں مایہ سونپ دی جائے۔

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن　　ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!

اس کے بعد "پیرِ رومی" اپنے زندہ رود کو شعر سنانے کی فرمائش کرتے ہیں، اور سید افغانی کی طرف دیکھ کر بعض حقائق و اشگاف کئے جاتے ہیں جس کے اندر خاص طور پر یہ بات بتائی گئی ہے۔

درگذر مثلِ کلیم از رودِ نیل　　سوئے آتش گام زن مثلِ خلیل

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست　　ملتے رامی بردتا کوئے دوست

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح "رودِ نیل" سے گذر جانا چاہیئے یعنی جب فرعون اور فرعونیوں نے حضرت موسیٰؑ کا تعاقب کیا تو حضرت موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی سمندر پر ماری جس سے سمندر میں ایک صاف راستہ نکل آیا اور پھر فرعون اپنے لشکر سمیت ڈوب گیا یہ واقعہ قرآنِ عزیز نے متعدد مقامات پر مختلف بلاغت پرور اسالیب سے پیش فرمایا ہے۔

یہاں یہ مقصود ہے کہ آج بھی ضرورت ہے کہ "ضربِ کلیم" کے ذریعہ باطل کے "رودِ نیل" کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور اس میں سے خیر و خوبی کے ساتھ سلامتی سے پار ہو جائیں اور آنے والے فرعونیانِ وقت کو ڈوبنے کے لیئے چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ ہم آج اسکا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ جن کی ضرب میں کلیمی قوت ہے وہ وقت کی تمام فرعونی طاقتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور ہر اس

تحریک سے نہایت دانائی سے نکل جاتے ہیں جو اسلام و فطرت کے خلاف ہوتی ہے اور جن میں "موسوی" صداقت نہیں ہوتی وہ باطل کے "رود نیل" میں نذر موج ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں بھی اس قرآنی داستانِ عبرت کی طرف نہایت بلیغ کنایہ کیا گیا ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم، وطن، برادری کے تمام غیر فطری نظریات کا انکار کر دیا تو ان کے سامنے دو چیزیں پیش کی گئیں یا تو اپنی فطری وجدان کی صدائے حق سے دست بردار ہو جائیں، توحید کے وعظ چھوڑ دیں اور غیر اللہ کی پرستش قبول کر لیں یا "آگ میں جلنا" اور مصائب و تکالیف کا جھیلنا گوارا کریں حضرت ابراہیم نے اپنی خداداد فہم و بصیرت اور نورِ نبوت کے مطابق "آتشِ نمرود" کو پسند فرمایا اور بے خطر آگ میں کود جانا گوارا فرمایا اسی طرح آج بھی دو راہیں دنیائے انسانی کے آگے آئی ہیں یا تو حق کا اعتراف و اقرار کر کے وقت کی تمام نمرودی طاقتوں کا حکم قبول کیا جائے یا انکار کر کے ابراہیمی سنت کی پیروی کی جائے مگر جس مردِ مومن میں ابراہیمی ایمان خلیلی ایقان کی روشنی ہو گی وہ حق و صداقت کی راہ میں آفات و مصائب کو برداشت کرنا آسان سمجھے گا اور انکارِ حق کی راہ کبھی نہ اختیار کرے گا۔ اس کے لیے "آتشِ نمرود" اسی طرح سرد ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم کے حق میں ہوئی تھی اور اس "ابراہیمی

مرد" کے "نغمہ" سے "بوئے دوست" آنے لگے گی اور اس کے نتیجہ میں ایک "ملت" کی تشکیل ہوگی جس کو وہ کوئے دوست کی طرف لے جائے گا یعنی ابراہیمیت اختیار کرنے کے بعد تمام نمرودی طاقتیں سرنگوں ہو جائینگی اور اس کو مقام "خلت" اور "امامتِ کبریٰ" کا جلیل القدر منصب اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوگا عارضی طور پر اس کو ابراہیمی ابتلاء کے ماحول سے گذرنا پڑے گا، اس کے بعد زندہ رود غزل سنانے لگتا ہے جس میں لطیف پیرایہ کے ساتھ موجودہ دور کے مدعیانِ دینِ حنیف کی شکوہ سنجی اور نالا کیفی پر ماتم کیا جاتا ہے ایک شعر سُن لیجیے۔

چہ حرمہا کہ درونِ حرمے ساختہ اند
اہلِ توحید یک اندیش و دو نیم اند ہمہ

اس کے بعد فلکِ عطارد ختم ہوتا ہے اور فلکِ زہرہ میں پہنچتے ہیں۔

جاوید نامہ پر ایک نظر

از

چوہدری محمد حسین، ایم۔ اے

یہ مضمون چوہدری محمد حسین صاحب ایم۔اے نے جو ان دنوں پنجاب میں پریس برانچ کے انچارج اور اسسٹنٹ ہوم سکرٹری اور اسسٹنٹ پراونشل پیریکٹر ولر ہیں ۱۹۳۲ء میں تحریر فرمایا تھا۔ آپ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے قدیمی دوستوں اور قدر شناسوں میں سے ہیں۔ آپ دنیاوی مصروفیتوں سے جس قدر وقت بچا سکتے وہ تمام تر اپنے دوست علامہ اقبال کی صحبت میں گذارتے۔ یہ دوستی صرف علمی مناسبت ہی کی وجہ سے تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے علمی مطالعہ سے فائدہ اُٹھاتے، دونوں کا فکر و تدبر ایک دوسرے کیلئے مشعلِ راہ بنتا اور دونوں ایک دوسرے کی مدد سے مسلمانوں کی حیات سیاسیہ و دینیہ کی گتھیاں سلجھانے کیلئے زیادہ سے زیادہ جد و جہد کرتے یہ جاوید نامہ جس کی ایک جھلک ان اوراق میں آپکے سامنے ہے اسی طرح کی ایک شاندار کوشش کا نتیجہ ہے۔ اہلِ علم کے نزدیک جاوید نامہ علامہ کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کے معرضِ وجود میں آنے کیلئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔

اے کاش جاوید نامہ ہر مسلمان بچے اور جوان کو لازمی تعلیم کے طور پر پڑھایا

جا سکتا۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اگر اس کتاب کے مطالب کو عام کر دیا جائے تو صرف یہی ایک کتاب مسلمانوں کی حیاتِ نو کی ضامن ہو سکتی ہے۔ مگر برعکس اس کے اس کتاب کے ساتھ یہ ناانصافی ہوتی جا رہی ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن گزشتہ چودہ سال کے اندر ایک دفعہ بھی نہیں طبع ہوا۔ پہلا ایڈیشن جو علامہ مرحوم نے طبع کرایا بس وہی طبع ہوا پھر دوبارہ اس کو طبع کرانا کبیرہ گناہ سمجھا گیا اور اس طرح جہاں ایک طرف علامہ کے بچوں کو مالی نقصان پہنچا وہاں قوم کو ایک عظیم الشان علمی اور انقلابی ترقی سے روکا گیا۔ ہماری دعا ہے کہ خدائے کریم ان لوگوں کو جن کے ہاتھ میں علامہ کی کتابوں کی اشاعت ہے اس امر کی توفیق عطا کرے کہ وہ ان کی کماحقہ اشاعت کر سکیں۔

خاکسار

محمد شاہ

مہتمم اقبال اکیڈمی

لاہور

مقدمہ

از

خان بہادر چودھری محمد حسین صاحب ایم۔اے

حضرت اقبال مدظلہ نے ۱۹۲۹ء کی ابتدا میں جاوید نامہ لکھنا شروع کیا۔ کم و بیش تین سال کے بعد یعنی اب ۱۹۳۲ء میں یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔

"جاوید نامہ" دراصل "معراج نامہ" ہے۔ اسرار و حقائق معراج محمدیؐ پر کتاب لکھنے کا ایک مدت سے حضرت علامہ کا خیال تھا۔ کتاب کا نام بجائے "معراج نامہ" کے "جاوید نامہ" رکھنے کی محرک دو تین باتیں ہوئیں۔ اسلام کی بہت سی اور باتوں کی طرح مسلمانوں نے حقیقت معراج پر بھی بہت کم غور کیا ہے۔ دراصل "گلشن رازِ جدید" کی طرح علوم حاضرہ کی روشنی میں معراج کی شرح لکھ کر ایک قسم کا "معراج نامہ جدید" لکھنے کا خیال تھا۔ یہ "معراج نامہ" بہت ممکن ہے عام شرحی انداز تحریر میں ہوتا اور اپنی موجودہ "آسمانی" ڈرامہ کی شکل اختیار نہ کرتا۔ لیکن اس اثنا میں اٹلی کے مشہور شاعر ڈینیٹے کی کتاب "ڈیوائن کامیڈی" پر بعض نئی اور اہم

تنقیدات یورپ میں شائع ہو چکی تھیں۔ جن میں اس حقیقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا گیا کہ "ڈیوائن کامیڈی" کے آسمانی ڈرامے کا تمام پلاٹ بلکہ اس کے بیشتر تفصیلی مناظر ان واقعات پر مبنی ہیں اور اُن کی نقل ہیں جو اسلام میں معراج محمدیہ کے متعلق بعض احادیث میں مذکور ہوئے یا بعد میں بعض مشہور متصوفین و اُدبا کی ان کتابوں میں درج ہوئے جن میں اُنھوں نے مختلف نقطہائے خیال سے خود اپنے معراجوں کا ذکر کیا یا معراج نبوی کی شرح لکھی ایک حد تک اس واقعہ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ بجائے عام تشریحی انداز میں "معراج نامہ" لکھنے کے جو مضامین کے لحاظ سے یقیناً حقائقِ معراج کے مباحث ہی تک محدود رہتا ڈینٹے کے انداز میں ادبی (عرفانی نہیں) نقطۂ نگاہ سے "معراج اقبال" لکھا جائے۔ جس میں قید مباحث سے آزادی ہو۔ اور تخیل و ادراک، تاویل و تفسیر کی محدود وسعتوں سے گذر کر فکر و بصیرت اور اختراع و الہام کی جن لامحدود فضاؤں تک پرواز کرنا چاہیں بآسانی کر سکیں۔ "جاوید نامہ" اور "ڈیوائن کامیڈی" یہ مرکب الفاظ ایک دوسرے کے مترادف نہیں (غالباً جیسا کہ آئندہ بیان کیا جائے گا ایسا ہونا ضروری تھا) تاہم بادی النظر میں ایک معنوی سی مناسبت دونوں ناموں میں موجود ہے۔ حضرت علامہ کے فرزند ارجمند عزیزی جاوید اقبال سلمہٗ کا نام

بھی کسی حد تک "جاوید نامہ" ہونے کا ذمہ دار ہے۔ لیکن ان خاص معنوں میں "جاوید نامہ" کتاب کا وہ آخری حصہ ہے جو آسمانی ڈرامہ کے خاتمہ کے بعد بطور ضمیمہ آتا ہے اور جس کا نام "خطاب بہ جاوید" (سخنے بہ نژادِ نو) ہے

"ڈیوائن کامیڈی" کا نام ڈیوائن کامیڈی خود ڈینٹے کا تجویز کردہ نہیں۔ ڈینٹے نے اپنے آسمانی ڈرامے کا نام محض "کامیڈیا" رکھا تھا لفظ "ڈیوائن" (پاک۔ الٰہیہ۔ آسمانی) کتاب کے نفسِ مضمون، اسکی خوبی، اسکی شہرت وہر دلعزیزی کی بنا پر ڈینٹے کے قدر دانوں اور مداحوں کی طرف سے بعد میں زیادہ کیا گیا۔ ڈینٹے کی موت ۱۳۲۱ء میں واقع ہوئی۔ "کامیڈیا" کے جس سب سے پہلے ایڈیشن کا نام "ڈیوائن کامیڈی" رکھا گیا وہ ۱۵۵۵ء میں چھپی۔ اگرچہ خود ڈینٹے کو ڈیوائن کہنا اس کے مداحین نے ۱۵۱۲ء ہی میں شروع کر دیا تھا۔

مشرق کے لوگ اگرچہ ابتک اس حقیقت سے بے خبر ہوں، اہلِ مغرب پر ہسپانیہ کے بعض مستشرقین کی جدید تحقیقات نے اب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ ڈینٹے کی "ڈیوائن کامیڈی" کا ماخذ اولاً وہ احادیثِ نبویؐ ہیں جن میں معراج کی کیفیات (بعض صورتوں میں باختلاف تفصیلات) مروی ہیں۔ ثانیاً وہ کتبِ تصوف وادب اسلامیہ جن میں اسرارِ معراجِ نبوی پر روشنی ڈالنے کے علاوہ بعض

صوورتوں میں مصنفین نے خود اپنی سیاحت عُلوی اور مشاہدۂ تجلّیات کا ذکر کیا ہے۔ مؤخر الذکر میں محی الدین ابن عربی کی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" اور ابو العلا معرّی کی تصنیف "رسالۃ الغفران" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میڈرڈ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر آسن جو اس نہایت اہم انکشاف کے بانی ہوئے۔ اپنی معرکتہ الآرا کتاب "اسلام اینڈ ڈیوائن کامیڈی" میں لکھتے ہیں۔

"جب ڈینٹے الیغیری اپنی اس حیرت انگیز نظم کا تصوّر اپنے ذہن میں لایا اس سے کم از کم چھ سو سال قبل اسلام میں ایک مذہبی روایت موجود تھی جو محمد (صلعم) کی مساکنِ حیاتِ مابعد کی سیاحتوں پر مشتمل تھی۔ رفتہ رفتہ آٹھویں صدی سے لیکر تیرھویں صدی عیسوی کے اندر اندر مسلم محدثین علماء مفسرین۔ صوفیاء حکما اور شعرا سب نے ملکر اس روایت کو ایک مذہبی تاریخی حکایت کا لباس پہنا دیا۔ کبھی یہ روائتیں شرح معراج کی شکل میں دُہرائی جاتیں۔ کبھی خود راویوں کی واردات کی صورت میں اور کبھی ادبی اتباعی تالیفات کے انداز میں۔ ان تمام روایات کو ایک جگہ رکھ کر اگر "ڈیوائن کامیڈی" سے مقابلہ کیا جائے تو مشابہت کے بیشمار مقامات خود بخود سامنے آجائینگے۔ بلکہ کئی جگہ بہشت و دوزخ کے عام خاکوں انکے منازل و مدارج۔ تذکرہائے سزا و جزا۔ مشاہدہ مناظر

اندازِ حرکات و سکناتِ افراد۔ واردات و واقعاتِ سفر۔ رموز و کنایات۔ دلیلِ راہ کے فرائض اور اعلیٰ ادبی خوبیوں میں مطابقتِ تامہ نظر آئے گی۔"

پروفیسر آسن نے احادیثِ معراج کو بلحاظ اسناد تین زبانوں میں تقسیم کر کے ہر زمانہ کی روایت کے تفصیلی اختلاف کو قصۂ معراج کے ارتقا کا موجب قرار دیا ہے۔ لیکن اس امر کو ذکر کر کے کہ رسولِ عرب سے پہلے بھی بعض پیغمبروں کے متعلق معراج کی روائتیں موجود تھیں بلکہ ارداویراف کی ایرانی بہشت کی سیر کے قدیم افسانے بھی مذکور ہوتے تھے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ "ان سیاحتوں اور معراجوں میں کوئی بھی اتنا واضح، وسیع اور مکمل نہ تھا جس قدر کہ اسلامی راویت اپنے لٹریچر میں تھی۔ اس کے علاوہ اسلامی روایت ہر عالم و جاہل مسلمان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اور اسکو صحیح تسلیم کرنا ان کے ایمان کا جزو تھا۔ آج اس وقت بھی تمام اسلامی دنیا میں معراج پیغمبرؐ کا دن مذہبی تیوہار کا دن سمجھا جاتا ہے۔ اور ٹرکی، مصر، مراکش جیسے اسلامی ممالک میں اس روز قومی تعطیل منائی جاتی ہے۔ اسی سے واضح ہے کہ پیغمبر (علیہ السلام) کی معراج کے واقعہ میں مسلمانوں کا عقیدہ کس قدر راسخ ہے۔" پروفیسر آسن نے اگر خود اسلامی دنیا کی سیر کی ہوتی اور مسلمانوں کی ہر زبان کے لٹریچر کو بہ نظر غائر دیکھا ہوتا تو اسکو معلوم ہوتا کہ معراج پیغمبرؐ کی روایت کا مسلمانوں

کے عقیدہ اور تصور پر اتنا تسلط ہے کہ کوئی زبان دُنیا میں ایسی نہ ہوگی جسے عام طور پر مسلمان بولتے ہوں اور اس میں "معراج نامہ" موجود نہ ہو۔ بلکہ سچ پوچھو تو مسئلہ معراج جسمانی تھی یا روحانی اس اختلاف پر لڑائیوں تک نوبت پہنچی۔

روایت معراج کے مختلف پہلو

معراج کا مذہبی اور علمی پہلو تو وہی ہے جسے مشاہدۂ تجلّی ذات یعنی ( ) کہنا چاہیئے۔ اور جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیب ہُوا۔

دوسرا پہلو وہ ہے جسے تصوف کا پہلو کہنا چاہیئے۔ صوفی کا معراج بھی دراصل ایک قسم کا علمی اور مذہبی پہلو رکھتا ہے مختلف صوفیا نے مختلف رنگوں میں تجلی ذات کے مشاہدہ کا ذکر کیا ہے۔ تصوف ان طریقوں کا نام ہے جن سے براہ راست معرفتِ ذات باری کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور جو لوگ ان طریقوں کے اختیار میں تجلی ذات کے پرتو سے بہرہ یاب ہوئے اُنہوں نے بعض اوقات اس حصول مقصد کو معراج سے تعبیر کیا۔ اعاظم صوفیہ میں بایزید بسطامی اور محی الدین ابن عربی کا معراج عام مشہور ہے۔ حضرت بایزید بسطامی کے

معراج کے کیفیات تو شاید قلمبند ہی نہ ہوئیں۔ لیکن محی الدین ابنِ عربی نے "فتوحاتِ مکیہ" میں اپنے معراج پر دو دفتر لکھے ہیں۔ اور سیاحتِ علوی میں دو افراد کو اپنا راہنما اور ساتھی بنا کر جن میں سے ایک فلسفی ہے اور دوسرا عالمِ دین۔ ان کی زبان سے تمام دنیا جہان کے علوم و فنون اور مسائل و مباحث کے متعلق اس انداز میں اظہار خیالات فرمایا ہے کہ گویا یہ سب خیالات وہ انکشافات و الہامات ہیں جو ان کے قلب پر معراج میں وارد ہوئے۔ خالص عرفانی ہونے کی بجائے محی الدین ابن عربی کا معراج زیادہ تر مذہبی ہے۔ سیاحت آسمان اور مشاہدۂ ذات کے حقائق بے حد تفصیلات سے دیئے ہیں تاہم مذہبی اور اخلاقی مباحث میں جس قدر توجہ صرف ہوئی ہے۔ وہ عرفانی مباحث کی صورت میں نہیں۔ منازل۔ مناظر و واقعات کیفیات۔ مشاہدات کم و بیش ایسی ترتیب میں ہیں جس میں معراج پیغمبرِ۔ تاہم تفصیلات و تصریحات نے تصویر کو اس کامل صورت میں پیش کیا ہے۔ کہ ڈینٹے کے نقاد کو "ڈیوائن کامیڈی" کا تمام نقشہ "فتوحات مکیہ" کے انہیں ابواب کا چربہ نظر آتا ہے جس میں معراج کا ذکر ہے۔

معراج کا تیسرا پہلو خالص ادبی (   ) اور آرٹسٹک (   ) ہے۔ ادبی پہلو ضروری نہیں کہ اخلاق اور مذہب کی جھلک سے بالکل معرا ہو۔ مشہور عربی نابینا شاعر ابو العلا معری کا "رسالہ

الغفران" اسی ادبی پہلو کا حامل ہے۔ یہ رسالہ ابوالعلا معرّی نے اپنے ایک شاعر اور ادیب دوست ابوالقارح جلبی کے ایک خط کے جواب میں رقم کیا جس میں ابوالقارح نے باوجود ابوالعلا کا مدّاح ہونے کے اُس پر طنز کے پیرایہ میں ان شعرا اور ادبا کو موردِ عتاب الٰہی قرار دیا تھا جنھوں نے گنہگاری کی زندگی بسر کی ہو۔ ابوالعلا نے رسالۃ الغفران میں ادبی رنگ میں اپنی بہشت و دوزخ کی سیر دکھائی اور وسعتِ رحمت ذات کو واضح کرنے کے لئے کئی بدکاروں، گنہگاروں اور جاہلیت کے شعرا کو جنھوں نے بالآخر مرنے سے پہلے توبہ کرلی تھی غفران و رحمت کا سزاوار ہوتے اور جنت میں داخل ہوتے دکھایا۔ پروفیسر آسن کا خیال ہے کہ "ڈیوائن کامیڈی" کی بعض ادبی خوبیاں "رسالۃ الغفران" کے خصوصیات کی شرمندۂ احسان بھی ہیں۔ رسالۃ الغفران میں نہ صرف بعض قدیم و ہمعصر شعرا وغیرہ کے کلام پر تنقید ہے۔ بلکہ علمائے لغت وغیرہ سے ملاقات کے دوران میں بعض لغوی مسائل پر بحثیں بھی ہیں۔

اسی طرح شہرزوری کا ایک قصیدہ سفرِ روح کے متعلق ہے جسکو ابنِ خلکان نے نقل کیا ہے اور وسٹن فیلڈ نے ترجمہ کرکے شائع کیا ہے۔

ممکن ہے اسلامی لٹریچر میں اور بھی کئی کتابیں ایسی ہوں جنہیں معراج کے عرفانی اور ادبی پہلوؤں کے نمونے کہا جاسکے۔ لیکن اس کے

متعلق تحقیق کی ضرورت ہے۔ یوں معراج نبوی کے اسرار و حقائق کا تذکرہ اسلامی لٹریچر میں قریباً ہر بڑے مصنف کی کسی نہ کسی تصنیف میں ملیگا۔ اسلامی مصنفات پر ایک زمانہ میں یہ رنگ بھی غالب رہا ہے کہ حمد باری تعالیٰ کے بعد جب نعت پیغمبر لکھنے پر مصنف یا شاعر آیا تو اُس نے معراج رسول اللہ پر علیحدہ مستقل باب لکھا۔ نظامی کا "پنج گنج" اٹھا کر دیکھئے قریباً ہر کتاب میں یہ خصوصیت ملیگی۔

مغرب میں معراج کی روایت

پروفیسر آسن کی تحقیق کے مطابق معراج کی روایت مغرب میں ہسپانوی علماء و صوفیائے اسلام کے ذریعہ پہنچی۔ ڈینیٹے کی "ڈیوائن کامیڈی" کو معراج کے ادبی پہلو کا دوسرا بڑا نمونہ کہنا چاہیئے۔ یہ امر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا متحقق ہے کہ ڈینیٹے نے محی الدین ابن عربی کی کتاب "فتوحات" سے بہشت و دوزخ و اعراف اور ان کی تمام منازل و مناظر کو نقل کیا۔ اسی طرح تمام علوم مروّجہ پر اپنی بصیر کے دوران میں بحثیں کیں۔ البتہ سیاسی اور تاریخی واقعات وغیرہ کی بحث سے اپنی کتاب کی خوبیوں کو بڑھایا اور اپنے ماخذوں کا ذکر نہ کر کے ایک آنے والے طویل زمانہ یورپ پر اپنی شاعرانہ و حکیمانہ خوبیوں کا سکہ بٹھالیا۔ "فتوحات" اور "ڈیوائن کامیڈی"

کا مقابلہ اس مضمون کو غیر متعلق اور طویل مباحث میں لے جائیگا۔ ورنہ بتایا جاسکتا تھا کہ جو لوگ مغرب میں بڑے بڑے ادبی۔ علمی اور سیاسی انقلابات پیدا کر گئے۔ وہ اسلامی علوم و تہذیب سے کسقدر خوشہ چینی کے بعد اس قابل ہوئے۔

جاوید نامہ۔ روایت معراج کا تیسرا ادبی نمونہ

اسلامی روایتِ معراج کے دنیا میں مشہور ہونے سے چھ سو سال بعد ڈینٹے نے اپنے تخیلی معراج کے مشاہدات کی صورت میں اس زمانہ کے علوم و فنون پر تبصرہ۔ مغربی عیسائی اقوام کی مذہبی اور اخلاقی کمزوریوں پر جرح اور بیابیات یورپ کے صحیح کوائف کا وہ مرقع اہلِ مغرب کے سامنے کھینچا کہ نصف ربع مسکون کی اُس وقت کی نسلوں کے دل و دماغ۔ اخلاق و عادات اور احساس و شعورِ حیات میں وہ ہیجان رونما ہوا۔ جو تھوڑا ہی عرصہ بعد یورپ کی عام علمی و سیاسی نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ڈینٹے کی موت سے تقریباً پورے چھ سو سال کے بعد اقبال کا "جاوید نامہ" اہلِ مشرق کے سامنے حال کی مقتضیات و ترقیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قریباً انہیں مباحث و مقاصد کو پیش کر کے اس حصہ دنیا میں ویسے ہی انقلابات کا پیش خیمہ ہونیوالا ہے "جاوید نامہ"

کو ہم روایتِ اسلام معراج کا تیسرا اہم ادبی نمونہ کہیں گے۔ ممکن ہے اسے پھر سو سال کے عرصے میں کسی اور مسلم صوفی یا شاعر نے بھی اس موضوع پر کچھ لکھا ہو۔ لیکن جہاں تک ہم کوشش کر سکے ہیں عام "معراج ناموں" کے سوائے اس کی حیثیت قصے کہانیوں سے زیادہ نہیں کوئی قابلِ ذکر تصنیف اس بحث پر دستیاب نہیں ہو سکی۔

معراج نبوی فتوحات مکیہ اور ڈیوائن کامیڈی

"فتوحات" اور ڈینٹے کے آسمانی ڈرامے میں جو عام مماثلت ہے اس پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں دونوں تصانیف میں جس خاص فرق کی طرف یہاں اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ "فتوحات" کا مصنف خود صوفی اور صاحب حال تھا۔ اس کی تصنیف اس کے اپنے مکاشفات و واردات اور روحانی و عرفانی تصرفات کا آئینہ ہے۔ اس کی بناء محض تخیل یا آرٹ نہیں۔ ڈینٹے نے "فتوحات" کی پیش کردہ تصویر کے تقریباً ہر خط و خال کو اپنے موقلم کی نگارش کی صورت میں پیش کیا۔ لیکن اس کا کارنامہ بہترین ادبی تصنیف کے رتبہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مگر اس کی تحقیقات بعض مقاصد میں بنی نوع انسان کے اخلاقی اور معاشرتی مسائل پر "فتوحات" کے مقابلہ میں اتنا زیادہ ...

اثر ڈال گئیں۔ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ حیات مابعد الموت کی حقیقتوں کے تجسس میں ابن عربی اور ڈینٹے دونوں نے سات ستاروں (بعض صورتوں میں نو) کی سیر سے گذر کر بہشت دوزخ اور اعراف کی فضاؤں کے نقشے کھینچے ہیں۔ اور اصلاً ان کو اسی طرح تصور کیا ہے۔ جس طرح وہ احادیث نبوی میں بیان ہوئے۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ معراج نبی میں اقصیٰ سے لیکر مدود آسمان سے پار جانے تک میں کسی درمیانی فلک یا ستارہ کی سیر کا ذکر نہیں۔ البتہ بعض احادیث میں واپسی کے موقعہ پر بعض ستاروں کی سیر کا ذکر ہے۔ معراج نبوی کا عام ذکر لکھنے والے مدارج عروج ہی میں سیر سیارگان کو لے آتے ہیں۔ مگر یہ قصے زیادہ تر کمزور احادیث پر مبنی ہیں۔ یا ان کا ماخذ محی الدین ابن عربی کی "فتوحات" ہوتی ہے۔

فتوحات۔ ڈیوائن کامیڈی اور جاوید نامہ

"جاوید نامہ" کو "ڈیوائن کامیڈی" اور "فتوحات" سے دو باتیں ممیز کرنے والی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس میں وہ تمثیلی مظاہرات و معمات (ناپید ہیں۔ جو اُن میں ہر مقام پر ملتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے آج تک ان کے بعض مباحث عقدۂ لاینحل سے زیادہ

حیثیت نہیں رکھتے۔ دوسری یہ کہ اقبال نے زیادہ تر سیارگاں (وہ بھی سات نہیں بلکہ چھ) کی سیاحت پر اکتفا کی ہے۔ دوزخ و اعراف کے نزدیک تک نہیں گیا۔ بجائے ساتویں ستارہ میں پہنچنے کے "آنسوئے افلاک" جا نکلا ہے۔ اور یہ غالباً اس لئے کہ "جنت" اور "حضور" و "تجلی" کے نئے تصورات اور نئے مقاصد و معانی و نیل کے سامنے رکھنے مطلوب تھے۔ یہ "ندائے جمال" کی سماعت کا شوق بھی کچھ کم کشش کا باعث نہ تھا۔ "کلیم اللّٰہی" مشکل تھی۔ لیکن "سمیع الٰہی" میں کیا باک ہو سکتا تھا۔

جن لوگوں کو واصل جہنم دکھانے کی ضرورت تھی اُن کو "فلکِ زحل" کے ایک قلزم خونیں میں مبتلائے عذاب دکھا دیا ہے اور وہ ایسے لوگ نہیں جو خالص مذہبی یا اخلاقی نقطۂ خیال سے مجرم و گنہگار ہوں بلکہ وہ ایسی ارواحِ رذیلہ ہیں جو ملک و ملت سے غدّاری کی مرتکب ہوئیں۔ اور جن کو دوزخ نے بھی اپنے اندر لینا قبول نہ کیا۔

"فتوحات" اور "ڈیوائن کامیڈی" حیات بعد الموت کے حقائق و کیفیات کی کُنہ معلوم کرنے کی مساعی ہیں۔ معنوی اعتبار سے دو نو جدا ہیں۔ ایک عام طور پر عرفانی مشاہدات کی حامل۔ دوسری علمی ادبی اور سیاسی نکات پر زیادہ حاوی۔ افراد کے اذہان و اخلاق کی شائستگی دونوں کا نصب العین ہے۔ تاہم "دعوتی" اور "ڈراما نویس" اپنی توجہ مختلف مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جہات

مابعد پر ہی مرکوز رکھتے ہیں۔ اقبال کہ حیاتِ مابعد (آخرت) کا مسئلہ بوجہ ایک مسلّم عالم و حکیم ہونے کے اسکے لئے بہت پیش پا افتادہ ہو چکا ہے۔ اپنی زیادہ تر توجہ حیاتِ حاضرہ یا حیاتِ مطلق یا بالفاظ دیگر بقائے حیاتِ انسانی کے مسئلہ پر صرف کرتا ہے۔ اسکے نزدیک یہ بات اس قدر اہم نہیں کہ مرنے کے بعد بہشت و دوزخ یا اعراف میں انسانوں کی زندگی کیسی ہوگی جس بات نے اسکو تمام عمر پیچ و اضطراب میں رکھا ہے۔ وہ یہی موجودہ حیاتِ انسانی ہے جو اقوامِ مشرق کے لئے بوجہ اُن سیاسی و اقتصادی پستی کی موت سے بدتر ہو چکی ہے اور جسکے پاکیزہ ارتقا کی ضرورتوں سے اہل مغرب بوجہ اپنے مذہبی روحانی اور اخلاقی انحطاط و تنزل کے غافل ہو چکے ہیں۔ اور وہ وقت قریب ہے کہ اسے ایک ایسی دنیاوی قیامت سے بہت جلد دوچار ہونا پڑے جو مشرق و مغرب دونوں کی موجودہ نسلوں کو تباہ و ہلاک کر کے تمام میں ایک ہموار نسل اور ایک اہم مقصد واحد قوم کے ظہور و فروغ کے لئے میدان صاف کر جائے۔ بقا و دوامِ حیاتِ انسانی کے مباحث بھی اشارہ کرتے ہیں کہ اقبال نے اس تصنیف کا نام "جاوید نامہ" کیوں رکھا۔

احادیثِ معراج۔ فتوحاتِ مکیہ۔ ڈیوائن کامیڈی اور جاوید نامہ اگر پہلو بہ پہلو بہ نظر امعان مطالعہ کیے جائیں تو شاید وہ تمام فرقِ مراتب سامنے آجائیں جس سے نبی۔ ولی۔ شاعر فلسفی۔ اور فلسفی شاعر کو متمیز کیا جا سکتا ہے

جاوید نامہ کے بعض اہم مباحث

پیشتر اسکے کہ مختصراً "جاوید نامہ" کے بعض اہم مباحث کا ذکر کیا جائے۔ کتاب کے دیباچہ کا جو صرف دو اشعار پر مشتمل ہے یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے شاید انسانی زندگی کا وہ نصب العین قارئین کے سامنے آجائے۔ جسکے مطابق شاعر یہ سمجھتا ہے کہ منزلِ آخرت میں قدم رکھنے سے پیشتر ممکن ہے حیات انسانی ابھی زمین کی طرح اور ستاروں کو بھی آباد کرے۔ یا اُن کے آباد کر چکنے کے بعد دوامِ ابد کی طرف انتقال سے پہلے اس زمینی ستارہ میں بطور آخری منزل کے وارد ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال موجودہ سائنس کے ان انکشافات پر مبنی ہے جنکے مطابق مریخ وغیرہ ستاروں میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ دیباچہ میں صرف یہ دو شعر ہیں۔

خیالِ من بتماشائے آسماں بوداست
بدوشِ ماہ و بآغوشِ کہکشاں بوداست
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بوداست

چونکہ خود احادیث معراج میں بعض اجرامِ سماوی کے اندر حیات انسانی کا ممکن ہونا ان ملاقاتوں کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔ جو پیغمبر خدا نے

معراج سے واپسی کے وقت مختلف انبیاء کرام سے کیں۔ اس لئے شاعر کا یہ تخیل محض سائنس کے تصورات پر مبنی نہیں کیا جا سکتا۔ خود محی الدین ابن عربی نے بہشت و دوزخ سے پہلے سیارگان کی سیاحت اپنے ان مکاشفات میں کی جو انہیں مکہ معظمہ کے دورانِ قیام میں حاصل ہوئے اور جنکو "فتوحات مکیہ" کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ پیغمبرِ خدا کی معراج کے سلسلہ میں بجائے "سیارگان" کے "افلاک" کا ذکر ہے۔ اقبال نے غالباً اسی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر جاوید نامہ میں قمر و عطارد و مشتری وغیرہ کو "فلک" کا نام دیا ہے۔

مناجات اور "اقبالی شکوے"

کتاب "مناجات" سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن ایسی مناجات کہ اقبال ہی کی زبان سے ادا ہو سکتی تھی۔ حقائق حیات کے متعلق.. مستفسرانہ انداز میں ذاتِ بازی کو مخاطب کرنا جیسا اقبال کو آیا شاید اولیائے خاص کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ ہر شعر۔ ہر مصرع تعلقِ ولایت پر دال ہے ناممکن ہے کہ شکوہ کا مصنف شکوہ کے اعادہ سے تھک جائے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جبتک اپنے مقاصد کو حاصل نہ کر لیگا خدا کا دامن نہ چھوڑیگا۔ مشہور اقبالی شکوے اس مناجات میں آگئے ہیں۔

"جہان ہفت رنگ" میں آدمی کی "ہم نفس" سے محرومی سب سے

پہلی شکایت ہے یہ موجودہ جہان اس کو راس نہیں آیا۔

آرزوئے ہم نفس می سوزدش
نالہ ہائے دلنواز آموزدش
لیکن ایں عالم کہ از آب و گل است
کے تواں گفتن کہ وارائے دل است

یہ "بلبل و بہار" کی دنیا پسند نہیں۔ اس کے متعلق پہلے طعنہ دیا تھا کہ

ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

اب مناجاتی التجائیں ہیں کہ اس "جہانِ چار سو" کی بجائے جس کا وجود ایک دوسرے سیّارہ کے وجود کا محتاج ہے وہ جہاں عطا کر جس پر "رفت بود" کا اطلاق نہ ہو۔

اے خوش آں روزے کہ از ایّام نیست
صبح او را نیم روز و شام نیست
اے خدا روزی کن آں روزے مرا
وا رہاں زیں روزِ بے سوزے مرا

گویا اس "مکانی وقت" سے دل بیزار ہے اور اس نئی قسم کے "روز" کا متمنی ہے جس کی شان یہ ہو۔

روشن از نورش اگر گردد روان

صورت را چوں رنگ دیدن متواں
غیبہا از تابِ او گردد حضور
نوبتِ او لایزال و بے مرور!

پھر سب سے بڑا شکوہ ہے کہ جس ہستی کی شان میں آیۂ تسخیر نازل کی جسکے دید کا متوالا سپہر نیلگوں کو بنایا جسے رازدانِ "وعلّم الاسما" کیا۔ گویا تمام عالم سے جسکو برگزیدہ کرکے اپنے رازِ دلوں کا محرم تک بنایا اور خود حکم دیا کہ ہر چیز مجھ سے مانگ۔ اسی سے خود اپنی ذات کو حجاب میں رکھا۔ مشاہدہ تجلی ذات کی عاشقانہ بیتابی کا اس سے بڑھ کر مظاہرہ کیا ہوگا۔

اے ترا تیرے کہ ما را سینہ سُفت
حرف ادعونی کہ گفت و با کہ گفت؟
روئے تو ایمانِ من قرآنِ من
جلوہ واری دریغ از جانِ من؟
از زیانِ صد شعاعِ آفتاب
کم نمی گردد متاعِ آفتاب

علم و عقل کی نعمتیں کافی ہیں۔ جس چیز کی طلب اور آرزو ہے اور وہ ملتی نہیں۔ وہ دید ذات ہے۔

بے تجلی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و دیں مجبوری است

عقل و دین اور معرفت یا مشاہدۂ ذات کے فلسفوں اور بحثوں میں پڑنے کا یہ مقام نہیں مضمون کے طویل ہو جانے کا ڈر ہے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حصولِ معرفت ( ) جس کا بار بار ذکر حضرت علامہ کے کلام میں آتا ہے۔ اسوقت فلسفہ نفسیات کا ایک اہم مبحث ہے جس پر اعلیٰ پایہ کے محققین کی توجہ مبذول ہو رہی ہے اور جو ممکن ہے کہ عام تجربہ اور مشاہدہ کی طرح ایک دن علم حقہ کے حصول کا عام ذریعہ بنجائے۔ حصولِ ابدیت کی آرزو کو پھر ایک دفعہ دُہرایا ہے اور کہا ہے ؎

آنیم من جاودانی کُن مرا
از زمینی آسمانی کُن مرا

اور اخیر میں ذاتی التجاؤں کو چھوڑ کر پھر وہی تقاضے آگئے کہ وہ ہم نفس عطا کر جن میں زندگی کا وہی شرار پیدا ہو جو مجھ میں ہے۔ جو میرے طوفان میں اس طرح پلیٹے جائیں کہ پھر میری حدود سے باہر نہ نکل سکیں ؎

بجرم و از من کم آشوبی خطا است
آں کہ در قوم فرود آید کجا است

پیرانی نسل سے قطعی نا اُمیدی ہے۔ آئندہ نسلوں کو آغوش میں لینے کی تمنا کے ساتھ اس پر مناجات کو ختم کیا ہے کہ الٰہی عہدِ حاضر کے نوجوان میری باتوں کو سمجھیں ؎

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن
دارم آں روزے کہ می آید، سخن!
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

تمہیدِ آسمانی

مناجات کے بعد "تمہیدِ آسمانی" میں آسمان کی زبان سے زمیں کو طعنہ دیا ہے ؎

خاک اگر دیدند شد جز خاک نیست
روشن و تابندہ چوں افلاک نیست

اس طعنہ کو سُنکر زمین خجل ہوئی جاتی تھی اور اپنے "دردِ بے نوائی" کا شکوہ خدا کے سامنے پیش کرتی تھی کہ "ز آنسوئے گردوں" تتلی کی یہ ندا آئی ؎

اے امینے از امانت بے خبر
غم مخور، اندر ضمیرِ خود نگر
شُستہ از لوحِ جاں نقشِ امید؟
نورِ جاں از خاکِ تو آید پدید

عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند
عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند

تمہید زمینی

"تمہید آسمانی" کے بعد "تمہید زمینی" آتی ہے۔ نظم کا یہ حصہ خاص طور پر اہم ہے۔ اس میں سیاحت سماوی کا آغاز ہوتا ہے۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو خیال ہوگا کہ "تمہید زمینی" پہلے اور "تمہید آسمانی" بعد میں ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن چونکہ ایک "زمینی" آسمان کی تسخیر کو روانہ ہونے والا تھا۔ اس لئے آسمان کی زبان سے پہلے زمین کو طعنہ دلا دیا۔ اور پھر اسکے بعد اسکی تسخیر پر کمر باندھی۔

"تمہید زمینی" کے اخیر پر مولانا روم کی زبان سے جو میرِ افلاک میں شاعر کے راہنما بنے ہیں۔ اسرارِ معراج نبوی کی شرح کی گئی ہے۔ معراج کے جسمانی یا روحانی ہونے کا مسئلہ ابتدا ہی سے مابہ النزاع چلا آتا ہے۔ اقبال نے اسکی تشریح ایک خاص ندرت سے کی ہے۔

آسمانی سیر کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ شاعر "تشنہ" اور "دور از کنارِ چشمہ سار" مولانا روم کی ایک غزل بے اختیار گانے لگتا ہے۔ جسے مفصلہ ذیل دو اشعار "اسرارِ خودی" کے سب سے پہلے ایڈیشن کے سرورق

کے اندر کی طرف چھپے تھے اور جن کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک طرح فلسفہ خودی کی تائید کے لئے کتاب "خودی" کی بسم اللہ سے پہلے چھاپا گیا ہے

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اس اثنا میں شام ہو جاتی ہے۔ آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔ لیکن شام متاع آفتاب سے ایک "پارہ" اُڑا کر اسے کوکب کی صورت میں اُفق پر نمایاں کرتی ہے۔ کہ اتنے میں ہے

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید
از پسِ کہ پارۂ آمد پدید

شاعر اسکی طلعت درخشندہ اور پیکر روشن سے کچھ عرصہ دنگ رہنے کے بعد اپنے فلسفیانہ سوالات اس پر کرتا ہے کہ "موجود" و "نا موجود" کیا ہے "محمود" و "نا محمود" کے کیا معنی ہیں۔ جب اپنے جوابات کے دوران میں مولانا روم کی روح اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ

برمقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

مردِ مومن در نسازد در صفات
مصطفیٰ راضی نہ شد اِلّا بذات

شاعر کی روح پھڑک اُٹھتی ہے۔ دیدِ ذات کا شوق مضطرب کرتا ہے۔ سوال ہوتا ہے کہ ذات تک رسائی کیسے ہو؟ ؎

باز گفتم پیش حق رفتن چساں؟
کوہ و خاک و آب را گفتن چساں

جواب کیا ملا؟ —— جس طرح ایک "پیدائش" سے آدمی دنیا میں آتا ہے۔ اسی طرح ایک اور "پیدائش" سے باہر بھی جا سکتا ہے۔

گفت اگر "سلطاں" ترا آید بدست
می تواں افلاک را از ہم شکست
نکتہ اِلّا "بسلطان" یاد گیر
ورنہ چوں مور و ملخ در گِل بمیر
از طریقِ زادن اے مردِ نکوے
آمدی اندر جہانِ چار سوے
ہم بروں جستن بزادن می تواں
بند ہا از خود کشادن می تواں

سوال و جواب کا سلسلہ آگے چلتا ہے۔ مولانا روم اس نے "زادن"

کی تشریح فرماتے ہیں۔ عشق کی قوت و برہانِ مبین کے کرشموں کا ذکر ہوتا ہے۔ مکان و زمان پر قابو پانے کے طریق بتائے جاتے ہیں۔ "نہ آسمان" اور "فراخائے جہان" کے خوف سے بے نیاز ہو جانے کی تلقین کی جاتی ہے زمان و مکان کی حقیقت بتائی جاتی ہے کہ

این دو یک حال است از احوالِ جاں

جان و تن کے صحیح تعلق کا راز بتایا جاتا ہے۔ اور ان تمام مقدمات کے بعد اخیر کے چند اشعار میں جو سوال و جواب ہوتے ہیں ان میں معراج کا نکتہ خود بخود واضح ہو کر پیشِ نظر آجاتا ہے ؎

چیست جاں؟ جذب و سرور و سوز و درد
ذوقِ تسخیرِ سپہر گرد گرد!
چیست تن؟ بازنگ و بو خوگردن است
با مقامِ چار سُو خوگردن است
از شعور است این کہ گوئی نزد و دُور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
وارہاند جذب و شوق از تحت و فوق
این بدن با جانِ ما انباز نیست
مُشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

اس مکالمہ کے بعد شاعر کے تن کا ہر ذرّہ پروازِ افلاک کے لئے سیماب کی طرح بے تاب ہو جاتا ہے۔ زمان و مکان کی روح جس کا نام شاعر نے "زرواں" رکھا ہے۔ ایک بادل کے پردے سے فرشتے کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور اس کو کہتی ہے کہ میں "زروان" ہوں تمام جہاں زمین و آسمان پر میری قاہری کا تسلّط ہے۔

نظم کے اس حصّہ میں شاعر نے زمان و مکان کے موجودہ تخیلات اور اُن کی اس حقیقت پر جو قرآنی آیات اور احادیث سے پیدا ہے عجب شاعرانہ و فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

محی الدین ابنِ عربی اور دینیٹے دونوں کا آغازِ سیاحت ایک پہاڑ کے قُرب سے ہوا۔ اتفاق ہے کہ اقبال کے سامنے بھی روحِ رومی ایک پہاڑ کے عقب ہی سے نمودار ہوتی ہے۔

فلک قمر

اس کے بعد معراج کا فلسفہ نہیں بلکہ خود شاعر کا اپنا معراج شروع ہوتا ہے۔ فلک قمر سب سے پہلے آتا ہے۔ رومی اس دنیا کے ہولناک کُہسار شاعر کو دکھاتا ہے۔ کچھ دور دونوں جاتے ہیں تو قمر کے ایک غار میں سب سے پہلا ہندوستان کا ایک قدیم عارف ملتا ہے جسے اہلِ ہند وجہاں

دوست" کے نام سے پکارتے ہیں۔ جہاں دوست "دوشوامتر" کا ترجمہ ہے۔ "دوشوامتر" مولانا روم سے سوالات کرتا ہے کہ عالم کیا ہے۔ آدم کیا ہے۔ حق کیا ہے۔ رومی دو شعروں میں نہ صرف عالم و آدم اور حق کا کُنہ بتا جاتا ہے بلکہ "عالم" و "حق" کے متعلق شرق و غرب کے رجحانات کی حقیقت بھی کھول کر رکھ دیتا ہے ؎

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم این شمشیر را سنگ فسن
شرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید، از حق رمید

جہاں دوست ان حقائق کو تسلیم کرتا ہے۔ مانتا ہے کہ مشرق وجود و عدم کے مسائل میں آجتک پھنسا رہا۔ لیکن وہ اسکے مستقبل سے نا اُمید نہیں۔ بتاتا ہے کہ کل قشمرود (فلک قمر کا ایک پہاڑ) کی چوٹیوں پر ایک فرشتہ آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی نگاہ سے ذوقِ دیدار ٹپکتا تھا۔ اور وہ نگاہ صرف ہمارے خاکدان (مشرق) پر بندھی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ اس "خاک خموش" میں تجھ کو اب کیا نظر آتا ہے۔ کہیں پھر کسی زہرہ کے جمال پر تو نظر نہیں۔ لیکن اس نے جواب کیا دیا۔ اپنی ٹکٹکی باندھنے کی وجہ کیا بتائی ؎

گفت "ہنگامِ طلوعِ خاور است
آفتابِ تازہ اورا در بر است
رستخیزے در کنارش دیدہ ام
لرزہ اندر کوہسارش دیدہ ام
عرشیاں را صبحِ عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشم ملتے!

"وشوامتر" کی زبان سے یہ پیغام مشرق اور بالخصوص ہندوستان اور اہلِ ہند کے نام لانا اقبال ہی کا حصہ تھا۔

اس کے بعد وادیٔ یرغمید میں شاعر اور اس کا راہنما داخل ہوتے ہیں۔ اس وادی کا نام فرشتوں کی زبان میں وادیٔ "طواسین" ہے۔ منصور حلاج کی مشہور تصنیف کتاب الطواسین فرانس میں طبع ہو چکی ہے طٰسٓ قرآنِ کریم کی ایک سورت کا نام ہے۔ اور قرآن کے حروف مقطعات میں سے ہے۔ منصور حلاج کی جدت کوشی کا یہ کمال تھا کہ اس نے اپنی تصنیف کے مختلف حصوں کو بجائے ابواب میں تقسیم کرنے کے ان کا نام طواسین (طٰسٓ کی جمع) رکھا بالکل اسی طرح جیسے کوئی مصنف لفظ "لوح" یا "منزل" بمعنی باب یا فصل استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ پارسی ادب مانع تھا کہ پیغمبروں سے بالمشافہ ملاقات کی جاتی۔ اس لئے شاعر نے

اس امر پر اکتفا کی ہے کہ بجائے ان سے مل کر گفتگو کرنے کے اُن کی "طواسین" یا بالفاظ دیگر الواح فلک قمر میں پڑی ہوئی دکھائی ہیں جنکے کتبوں میں سے ہر ایک کی تعلیم کا اہم پہلو واضح ہو گیا ہے۔ طواسین رُسل میں چار طواسین شامل ہیں۔ طاسین گوتم۔ جسکا عنوان ہے "توبہ آوردن زن رقاصہ عشوہ فروش"۔ طاسین زرتشت جسکا عنوان ہے "آزمائش کردن اہرمن زرتشت را۔ طاسین مسیح (رویائے حکیم طالسطائی اس میں دکھایا گیا ہے کہ مغربیوں نے دورِ حاضرہ میں عیسائیت کا کیا حال کیا ہے) طاسین محمدؐ (نوحہ روحِ ابوجہل در حرم کعبہ۔ کعبہ کے بتخانے سے حرم بنجانے پر ابوجہل کا یہ نوحہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے)

فلک عطارد

زاں بعد شاعر اور اس کا راہنما فلک عطارد میں پہنچتے ہیں۔ یہاں جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ افغانی سے تعارف کراتے وقت رومی بتاتا ہے کہ میرے ساتھی کا نام "زندہ رود" ہے (زندہ رود سے افغانی اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کے متعلق سوال کرتا ہے۔ زندہ رود جواب دیتا ہے۔ پھر افغانی اپنے جواب میں دین و وطن کا صحیح مفہوم بتاتا

ہے۔ اشتراک و ملوکیت دونوں طلسموں کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیاں ایں دو سنگ آدم زجاج

سعید حلیم پاشا مشرقیوں اور مغربیوں کے فطری اختلاف پر رائے زنی کے بعد کہتا ہے کہ افرنگیوں کا شعلہ اب "نم خوردہ" ہو چکا ہے۔ ان کی آنکھ اگرچہ تیز ہے۔ لیکن دل مردہ ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے جو یورپ کی نقالی شروع کی ہے اس سے ترک اس وقت جو اپنی طرف سے نئی باتیں پیدا کر رہے ہیں۔ وہ وہی ہیں جو یورپ میں پرانی ہو چکی ہیں۔ سعید حلیم کا ترک کے نام پیغام یہ ہے ؎

چوں مسلماناں اگر داری جگر
در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیات اوست
عصرہا پیچیدہ در آیاتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است
گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است

ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد فرماں جہانے در برش

زندہ رود کو شکایت ہے کہ قرآن تو موجود ہے۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ عالمِ قرآن کہاں ہے۔ اس کا جواب افغانی کی طرف سے آتا ہے۔ محکمات عالمِ قرآنی کی حقیقت بیان کی جاتی ہے۔

(۱) خلافت آدم (۲) حکومت الٰہی (۳) ارض ملکِ خداست۔ (۴) حکمت خیرِ کثیر است۔ یہ چار باتیں بطور محکمات و اصول قرآنی کے پیش کی گئی ہیں۔ طوالت کا خوف ہے۔ کیونکہ یہ مضمون اپنی حد سے پہلے ہی زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ ورنہ ان میں ہر مبحث ایک مستقل دفترِ تنقید و تشریح کا مقتضی ہے۔

اس کے بعد افغانی نے ملتِ روسیہ کے نام پیغام دیا ہے اس پیغام کی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کیلئے یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ چند اشعار نقل کر دیئے جائیں ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی
دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں

قیصرت را ہم شکستی استخواں
تا برافروزی چراغے در ضمیر
عبرتے از سرگذشتِ ما بگیر
پائے خود محکم گذار اندر نبرد
گردِ ایں لات و ہُبل دیگر مگرد
گروہٗ کارِ خداوندان تمام
بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام
اے کہ میخواہی نظامِ عالمے
جُستۂ اورا اساسِ محکمے ؟
داستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب
با سیہ فاماں یدِ بیضا کہ داد ؟
مژدۂ "لا قیصر و کسریٰ" کہ داد ؟
جز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

اس کے بعد اشتراکی نقطۂ نگاہ سے قرآن کے چند حقائق بیان فرمائے ہیں۔ ملوک کی قریہ ویرانی۔ ربوا کی حرمت۔ الارض للہ۔ بن تنا

لوا البرّ حتیٰ تنفقوا کی تشریح کی ہے ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لَنْ تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نداند لذتِ قرضِ حسن!
از ربا جان تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست
ایں "متاع" بندہ و مِلکِ خداست
بندۂ مومن امیں، حق مالک است
غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں
قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں
آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کنفسٍ واحدہ"

فلکِ زہرہ

شاعر کی جانِ پاک "سُو" سے "بے سوئی" کی طرف پرواز پر پرواز کیے جاتی ہے۔ ایک جہان میں مر کر دوسرے میں جا نکلنا دوسرے سے گزر کر تیسرے میں جا نکلنا اس کی فطری بے تابیوں کا خاصہ ہے۔ اور آخر اس کا منتہا کیا ہے ؎

می کُند پرواز در پہنائے نور
مخبلش گیرندہ جبریل و حور!
تا ز دو ما زاغ البصر، گیرد نصیب
بر مقامِ "عبدہٗ" گردد رقیب

مقام "عبدہٗ" ہر دو رقابت" کا مسئلہ کسی شاعر کے اس نعتیہ شعر سے زیادہ کہیں حل نہ ہوا ہو گا ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمی

سوادِ زہرہ میں جو منظر سب سے پہلے آتا ہے۔ وہ خدایانِ اقوام کہن کی مجلس ہے۔ بعض نام حقیقی ہیں اور بعض شاعر کی طباعی نے خود تراش لیے ہیں ؎

بعل و مرد و خ و یعوق و نسر و فنسر
رمخن و لات و منات و قسر و عنسر

ان میں سے ہر ایک اپنے از سرِ نو زندہ ہو جانے کے امکان پر ثبوت لا رہا ہے۔ اور اس بات سے کہ یہ عہد پھر بے "خلیل" اور بے بت شکن ہو چکا ہے ؎

بر قیامِ خویش می آرد دلیل
از مزاجِ ایں زمانِ بے خلیل

بعل ایک نغمہ گاتا ہے۔ یہ نغمہ نوحہ روحِ ابوجہل (طاسین محمد در فلک قمر) کا جواب سمجھنا چاہیئے۔ بتخانۂ کعبہ کو "حرم" میں تبدل دیکھ کر ابوجہل چلا اٹھا تھا ؎

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود
نوجوانان را ز دستِ ما ربود

اسلام کی موجودہ پستی کی کوئی حد ہے! ابوجہل کائنات سے اپیل کرتا ہے (خدا تو اس کا کوئی ہے نہیں) کہ محمد (صلعم) سے بدلہ لے۔ اس لئے کہ بقول ابوجہل ؎

مذہب او قاطع ملک و نسب
از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند

بعل کا نغمہ اُمید کا نغمہ ہے۔ "بت" نے جہاں بالواسطہ "بت پرست" کو تسلی دی ہے۔ وہاں اپنے ساتھی بتوں کے سامنے اعلان کیا ہے کہ "اب آدم پھر مجوس پرستی کی طرف راغب ہو چکا ہے وقت ہے کہ اُٹھو اور پھر دنیا کو اپنا پرستار بنا جاؤ۔ اس مادہ پرستی کو زندہ کرنے کیلئے وہ قدرتاً افرنگیوں کا ممنون ہے۔ کہتا ہے ؎

زندہ باد افرنگیِ مشرق شناس
آنکہ ما را از لحد بیروں کشید

پھر زیادہ اچھا موقعہ اس لئے پیدا ہو گیا ہے۔ کہ ابراہیمؑ کا قائم کردہ حلقۂ توحید و وحدت ٹوٹ چکا ہے۔ آلِ ابراہیمؑ "بے ذوق است" ہے ملک

ونسب کے نئے نصب العینوں نے دین و مذہب کو شکست دیدی ہے محمدؐ کا مذہب سب سے بڑا پہاڑ تھا جو ہمارے راستہ میں حائل تھا۔ لیکن اب اسوقت ہزاروں بولہب محمدؐ کے چراغ کو پھونکوں سے بجھانے کے درپے ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد مسافر فرعون اور لارڈ کچنر کی روحوں کو دیکھتے ہیں۔ لیکن کہاں؟ زہرہ کے ایک دریا کی تہہ میں۔ اس لئے کہ دونوں کا انجام سمندر کی تہہ میں غرقابی تھا۔ سمندر کے اندر یہ مجلس اس طرح منعقد ہوتی ہے۔ رومی اقبال کو کہتا ہے کہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے اور ڈر نہیں پیچھے چلتا آ۔ میں موسیٰ کی طرح سینۂ دریا کو چیرنا اور اس کے ضمیر کے اندر داخل ہو جانا جانتا ہوں۔ دونوں سمندر میں قدم رکھتے ہیں۔ تو سمندر اپنا سینہ کھول کر ان کو اندر آنے دیتا ہے۔ اس حیرت انگیز منظر کی تصویر شاعر نے اس طرح کھینچی ہے ؎

بحر ما را سینۂ خود را کشود
یا ہوا بود و چو آبے وا نمود
قعر او یک وادیٔ بے رنگ و بو
وادیٔ تاریکیٔ او تو بتو
پیر رومی سورۂ طٰہٰ سرود

زیرِ دریا ماہتاب آمد فرود!
گرہائے شستہ و عریان و سرد
اندر آں سرگشتہ و حیراں۔ دو مرد

اقبالؔ کے اس تخیل کی مثال اور ڈھونڈھئے۔ ابنِ عربی بلکہ دنیا کے تمام شعرا کے کلام میں مشکل سے ملیگی۔

فرعونؔ اور کچنرؔ حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کو تکتے رہ جاتے ہیں۔ آخر فرعون مسافروں سے پوچھتا ہے کہ یہ سحر۔ یہ جوئے نور۔ یہ صبح یہ ظہور یہاں سمندر کی تہہ میں کیسے پیدا ہو گئے۔ رومیؔ دو لفظوں میں اس کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ اور حقیقت منکشف کر دیتا ہے۔ فرعون کے سوال کا جواب صرف یہ ایک شعر ہے ؎

ہر چہ پنہاں ست ازو پیداستے
اصلِ ایں نور از یدِ بیضاستے!

فرعون آخری وقت سمندر میں ہاتھ پاؤں مار کر غرق ہونے سے پہلے اپنے ایمان کا اعلان کر کے رخصت ہوا تھا یعنی "آمنت بِرَبِّ موسیٰ وہارون" مسلمانوں کا عام عقیدہ ہے کہ یہ "ایمان بالیاس" تھا اور قابلِ قبول نہ تھا۔ تاہم یہ حقیقت شاعر کے سامنے ہے۔ فرعون کے لب پر رومیؔ کے یہ الفاظ سُنکر افسوس و ندامت

کے کلمات جاری ہو جاتے ہیں اور پکار اٹھتا ہے ؎

آہ نقدِ عقل و دین در باختم
دیدم و ایں نور را نشناختم

اپنے انجام اور ملوکیت و فرعونیت کے انجام پر آٹھ آٹھ آنسو روکر کہتا ہے ؎

چیست تقدیرِ ملوکیت؟ شقاق
محکمی جستن ز تدبیرِ نفاق

ملوکیت جو تدبیرِ نفاق کی پالیسی پر اپنی محکمی کا اساس رکھتی ہے۔ اس کا انجام سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ تہہ قلزم، موت کے دن سے آج تک فرعون یہ حسرت لیے بیٹھا ہے ؎

باز اگر بینم کلیم اللہ را
خواہم از وے یک دلِ آگاہ را

اس جواب کے بعد کچھ فرعون سے مخاطب ہوتا ہے۔ مصر میں زمانۂ حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائی ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اس سے اقوامِ پارینہ کے حالات و واقعات کا منکشف کرنا مقصود ہے۔ فرعون اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میری قبر تو

علم و حکمت کی اغراض سے کھود ماری۔ لیکن مہدی سوڈانی کی تربیت کے اندر کیا تھا کہ تو نے اپنے زمانے میں اس کو کھدوا ڈالا؟ اس کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔

دفعتہً "گلشنِ جنّت کی طرف درویش سوڈانی کی روح پرواز کرتی ہوئی اس بزم میں آنکلتی ہے۔ اور سب سے پہلے کچنر سے مخاطب ہوتی ہے ؎

گفت "اے کشنر اگر داری نظر
انتقامِ خاکِ درویشے نگر!
آسماں خاکِ ترا گورے نداد
مرقدے جز دریمِ شورے نداد"

اس تمام باب میں سب سے اہم وہ پیغام ہے جو مہدی سوڈانی نے اقوامِ عرب و افریقہ کے نام دیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں سوائے چند اشعار کے زیادہ درج نہیں کیا جا سکتا ؎

گفت "اے روحِ عرب بیدار شو
چوں نیاگاں خالقِ اعصار شو
اے فواد، اے فیصل، اے ابنِ سعود
تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود

زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت
در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت
خاکِ بطحا خالدے دیگر بزائے
نغمۂ توحید را دیگر سرائے
اے نخیلِ دشتِ تو بالندہ تر
بر نخیزد بر تو فاروقے دگر؟
اے جہانِ مومنانِ مشک فام [۱]
از تو می آید مرا بوئے دوام
زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر
تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر
بر مقامِ خود نیائی تا بکے
استخوانم در بدن نالد چو نے
از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفیٰ است
مرد را روزِ بلا روزِ صفا است

[۱] اہلِ افریقیہ

فلکِ مرّیخ

فلکِ مریخ میں شاعر کے تخیل نے اس ستارے کو ایک فلاسفر

دکھایا ہے۔ جس کا نام حکیم مریخی ہے۔ وہ انجم شناس واقع ہوا ہے۔ مسافروں کی دنیا کے حالات سے آگاہ ہے۔ بلکہ کسی زمانہ میں اس کی سیر کر چکا ہے ایران و فرنگ دیکھ چکا ہے "نیل" و "رودِ گنگ" کے ملکوں سے خوب واقف ہے۔ بہرِ تحقیقِ فلزّات زمین، امریکہ، جاپان، چین، سب کی سیاحت کر چکا ہے۔ مسافروں کو بتاتا ہے کہ جہاں تم پہنچے ہو یہ شہر مرغدین کا نواح ہے۔ وہ خود یہاں کیوں پیدا ہوئے یہ تمام حالات بتائے جاتے ہیں۔ شہر مرغدین کے حالات میں حکیم مریخی کہتا ہے ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہاں زندہ رود یعنی (اقبال) اور حکیم مریخی میں تقدیر و تدبیر کے مسئلہ پر مکالمہ ہوتا ہے۔ زندہ رود تقدیر کے متعلق اپنا نیا نقطۂ خیال واضح کرتا ہے۔ جس مذہب نے "تقدیر" کو قناعت و سکون اور بے عملی سمجھ کر بطور عقیدہ کے دل میں جگہ دے لی ہے۔ اس کے متعلق کہتا ہے ؎

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا
باز در خوابِ گراں بارد ترا
سحر و افسون است یا دین است ایں   حبِ افیون است یا دین است ایں

تذکیرِ منبیۂ مریخ

فلکِ مریخ میں ہزاروں کاخ گذرنے کے بعد مسافر ایک جگہ دیکھتے ہیں۔ ایک شہر ہے اور اُس کے باہر ایک وسیع و فراخ میدان ہے۔ وہاں مرد و زن کا ہجوم ہے۔ گویا ایک عام جلسہ ہے جہاں ایک عورت تقریر کر رہی ہے۔ اسکا چہرہ بظاہر خوب چمکتا دمکتا ہے۔ لیکن اس کے تن میں نورِ جان پیدا نہیں۔ اس کے الفاظ بے سوز ہیں اور اس کی آنکھ بے نم۔ یعنی سُرورِ آرزو و محبّت سے یکسر نا محرم ہے۔ اس کا سینہ جوشِ جوانی سے خالی اور اُس کا "آئینہ" کور و "صورت ناپذیر" واقع ہوئی ہے۔ یہ فیشن و آزادی کا دلدادہ محبّت اور آئینِ محبّت سے قطعاً بے خبر ہے۔ مراد یہ کہ مرد کی صحبت سے گریزاں ہے اور اس سے ازدواج کے تعلق کو بُرا سمجھتی ہے۔ یہ وہی رنگ ہے جو اب یورپ کی عورتوں کی تقلید میں مشرق کی عورتیں بھی اپنے اوپر وارد کرنے کی آرزومند ہو رہی ہیں۔ حکیم نکتہ داں مسافروں کو بتاتا ہے کہ یہ نوجوان لڑکی اہلِ مریخ سے نہیں بلکہ فرزمرز جیسے شاعر نے مریخ کا "آمرِ کردارِ شب" بیان کیا ہے اسے یورپ سے اُٹھا کر یہاں لے آیا ہے تاکہ مریخ کی عورتوں کے دل میں بھی اس کی تقلید کی خواہش پیدا کر کے انہیں بگاڑ دے۔ فرزمرز نے

"کارِ نبوت" (تبلیغ) میں اسے پختہ کر دیا ہے۔ لیکن وہ خود اب دعوٰی کرتی ہے کہ میں آسمان سے بطور تنبیہ نازل ہوئی ہوں اور میری دعوت "دعوتِ آخر زمان" ہے۔ اس کا خاص فن کیا ہے ؎

از مقامِ مرد و زن دارد سخن
فاش تر می گوید اسرارِ بدن

یہ فرنگی آزاد لڑکی جو اس دنیا کی لڑکیوں کو آزادی کے نئے رستہ پر لگا کر اب مریخ میں "کارِ نبوت" کے فرائض ادا کرنے جا پہنچی ہے۔ وہاں کی عورتوں کو اپنی تحریر و تقریر میں مردوں سے باغی ہو جانے کی تلقین کرتی ہوئی کہتی ہے ؎

اے زناں! اے مادراں! اے خواہراں!
زیستن تا کے مثالِ "دلبراں"[1]!
دلبری اندر جہاں مظلومی است
دلبری محکومی و محرومی است!
در دو گیسو شانہ گردانیم ما
مرد را نخچیرِ خود دانیم ما
مرد صیادی بہ نخچیری کند
گردِ تو گردد کہ زنجیری کند!

[1] مرد کی بیوی بنکر رہنا

ہمبرِ او بودن آزارِ حیات
وصلِ او زہر و فراقِ او نبات

پھر ایک نہایت دلچسپ انداز میں شادی سے بے نیازی اور ماں بننے کی مصیبت سے جو حیلے آجکل یورپ میں اختیار کئے جا رہے ہیں اُن کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور ان خیالات کی بیہودگی کا راز رومی کی زبان سے ظاہر کیا ہے۔

فلکِ مشتری

فلک مشتری میں ارواحِ جلیلۂ منصور حلاج۔ غالب اور ایران کی مشہور شاعرہ قرۃ العین ملتی ہے۔ نوائے حلاج۔ نوائے غالب۔ نوائے طاہرہ سننے کے بعد زندہ رود اپنی بعض مشکلات ان ارواحِ بزرگ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور ان کے جواب سُنتا ہے۔ مثلاً حلاج سے سوال ہوتا ہے ؎

از مقامِ مومناں دوری چرا؟
یعنی از فردوس مہجوری چرا؟

حلاج کے جواب میں جنت کی حقیقت پر شاعر اپنے تمام خیالات کو واضح کر جاتا ہے ؎

جنّت مُلامے و حور و غلام
جنّتِ آزادگاں سیرِ دوام

یہ الفاظ منصور کی زبان ہی کو سزاوار تھے ؎

عشقِ ما از شکوہا بیگانہ ایست
گرچہ اور اگریۂ مستانہ ایست
ایں دلِ مجبورِ ما مجبور نیست
ناوکِ ما از نگاہِ حُور نیست
آتشِ ما را بیفزاید فراق
جانِ ما را ساز گار آید فراق
بے خلشہا زیستن نازیستن
باید آتش در تنہ پازیستن!

بعض دوسرے سوالات کے جواب میں منصور تقدیر کی حقیقت پر بحث کرتا ہے۔ اور "انا الحق" کہنے کی وجہ سے اُسے کیوں دار پر لٹکایا گیا۔ اسکی تشریح کرتا ہے۔ ایک لطیف پیرایہ میں شاعر بتا گیا ہے کہ منصور کا "انا الحق" کہنا کفر نہ تھا۔ بلکہ "خودی" کے مظہرِ اتم ہونے کا مظاہرہ تھا۔ منصور "خودی" کے حقائق بیان کرتا ہے اور شاعر کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھو تو بھی ان ملاؤں کے نزدیک کم و بیش اُسی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے

جس کا ہیں ہوا انقاع ؏

آنچہ من کردم تو ہم کردی تبرس!

کیونکہ جس طرح میں نے اپنے سینے کی بانگِ صور یعنی آوازہ "انا الحق" سے ایک ایسی ملت کو جو "قصد گور" کر چکی تھی از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی اور اس کا بدلہ اُنہوں نے مجھے سولی پر لٹکا کر دیا اور الٹا کافر کہا اسی طرح تو نے بھی وہی حرکت کی ہے ؏

محشرے بر مُردہ آوردی بترس!

غالب سے پہلے اس کے ایک شعر کی شرح پوچھی ہے۔ یہ شعر دراصل اردو میں ہے۔ اور از بسکہ یہ اردو غالب کی کہی ہوئی ہے۔ اس لئے محض الفاظ ردیف کو فارسی میں بدل لینے سے فارسی شعر بن گیا ہے ؎

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

"سوختہ کیا ہے" کو "سوختہ چیست" بنا کر شعر فارسی میں بدل لیا گیا ہے۔ اس شعر کے مفہوم پر بعض ادبی رسالوں اور کتابوں میں کچھ عرصہ ہوا بحث چھڑی تھی۔ معارف کے کسی نمبر میں بھی ایک صاحب کے مضمون میں اس شعر پر بحث تھی۔ وہیں سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس شعر کی تشریح خود غالب کی زبان سے "جاوید نامہ" میں لکھی جائے اس

تشریح پر بحث مضمون کی غیر ضروری طوالت کا باعث ہے اس لئے اس میں دلچسپی رکھنے والے قارئین اصل کتاب میں پڑھ سکتے ہیں۔

اس سے آگے مسئلہ "رحمتہ اللعالمین" پر بحث ہے۔ غالب نے اس مسئلہ پر لکھتے ہوئے اپنی ایک مثنوی میں یہ شعر لکھا ہے۔

"ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمتہً للعالمینے ہم بود

جاوید نامہ میں اس نکتہ پر جو مکالمہ غالب و اقبال کے درمیان ہوا ہے۔ اس میں "رحمتہ اللعالمین" کے انتہائی حقائق و اسرار واضح کر دیئے گئے ہیں۔ غالب ایک طرح اس رمز کی صحیح حقیقت کے وا کرنے سے عاجز آجاتا ہے آخر منصور اس راز سے پردہ اٹھاتا ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاش مصطفےٰ است

اس پر "زندہ رود" مستفسر ہوتا ہے کہ پھر اس "جوہر" کا "سر" کیا ہے جس کا نام مصطفےٰ ہے وہ حقیقت میں "آدم" ہے یا کوئی "جوہر" ہے جو گاہے گاہے "وجود" میں آجاتا ہے۔ حلاج کے جواب نے اس نکتہ کی سات دقیق کنہوں کو طشت از بام کرنے کی کوشش کی ہے۔ "عبد" (آدم) کے کیا معنی ہیں اور "عبدہٗ" یعنی اللہ کا عبد" کیا شے ہے یہ اپنی قسم کی پہلی بحث ہے جو جاوید نامہ میں آئی ہے۔ "رحمتہ اللعالمین" کا نکتہ سمجھا چکنے کے بعد حلاج

اس صوفی پر افسوس ظاہر کرتا ہے جو ظاہری ہاؤ ہو میں مشاق ہے۔ لیکن "حکم حق" پہلے اپنی جان پر وارد کرنا اور پھر اسے جہان میں کرنا نہیں جانتا۔

وائے درویشے کہ ہوئے آفرید بازلب بربست و دم در خود کشید
خانقاہے جست و از خیبر رمید راہبی ورزید و سلطانی ندید!

موجودہ زمانے کے صوفی کو خطاب ہے ۔

نقشِ حق داری؟ جہاں نخچیرِ تست ہم عناں تقدیر با تدبیرِ تست
عصرِ حاضر با تو می جوید ستیز نقشِ حق بر لوح ایں کافر بریز!

یہ بحث ذرا طویل ہے کہ نقشِ حق جہان پر کس طرح وارد کیا جاتا ہے۔ "زورِ دلبری" سے یا "زورِ قاہری" سے؟

اس بحث کے اختتام پر ابلیس نمودار ہوتا ہے جسے شاعر "خواجہ اہلِ فراق" کا نام دیتا ہے۔ "نالۂ ابلیس" میں "ابلیسیت" کو صدمۂ "آدمیت" نے پہنچایا ہے۔ اس کا گلہ ہے۔ ابلیس روتا ہے کہ موجودہ "ابن آدم" تو میرا کوئی شکار ہی نہیں۔ اگر مجھے اتنا بڑا "ابلیس" بنانا تھا تو پھر میرا "منکر" بھی کوئی ایسا بنایا ہوتا جو میری گردن توڑتا۔ یہ آدم کیا کہ جس کو میں جس طرف چاہتا ہوں پیچھے لگائے پھرتا ہوں۔ خدا سے ابلیس کی آخری التجا یہ ہے ۔

اے خدا ایک زندہ مردِ حق پرست لذتے شاید کہ یابم در شکست!

فلکِ زحل

فلک زحل میں ایک خاص شاعرانہ پیرایہ میں ہندوستان کی بعض گذشتہ اور موجودہ سیاسیات زیرِ بحث آتی ہیں۔ فلک زحل کو شاعر نے ان ارواحِ رذیلہ کا مقام قرار دیا ہے۔ جنہوں نے ملک و ملت سے غدّاری کی اور دوزخ نے بھی اُن کو مرنے کے بعد قبول نہ کیا۔ اس "منزل ارواح بے یوم النشور" میں دو "طاغوت" دکھائے گئے ہیں۔ جنہوں نے ملک و ملت سے بیوفائی کی اور اپنے تن کی خاطر ملت کو قربان کر دیا۔ وہ دو "طاغوت" کون ہیں ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن!

اوّل الذکر نے نواب سراج الدولہ سے غدّاری کی اور موخر الذکر نے سلطان ٹیپو سے۔ دونوں کی غدّاری کا نتیجہ کیا ہے۔ یہ کہ اس پاک سرزمین میں غلامی کا بیج بویا گیا۔

جس عذاب میں یہ دونوں غدّار مبتلا ہیں اس کا ہولناک نقشہ کھینچنے کے بعد شاعر "روحِ ہندوستان" کو بصورت "حورِ پاک زاد" آسمان کے پردوں سے باہر آتے دکھاتا ہے۔ اور اسکے نالہ و فریاد کی تصویر اپنے خاص انداز میں پیش کرتے ہوئے ہندوستان کی موجودہ غلامی کے اسباب اور اُسکے موجودہ سیاسی حربوں کے حسن و قبح پر شاعرانہ انداز میں بحث

کرتا ہے۔

آخر میں وہ انتباہ ہے جو اس زمانے کے "غدارانِ ملک و ملت" سے ہوشیار رہنے کے متعلق ہندوستانیوں کو کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی تقدیر میں اس وقت تک غلامی باقی ہے۔ جب تک یہ "جعفر" اسکے اندر پیدا ہوتے رہینگے۔ کس طرح زمانہ ایک نئی قسم کے "جعفر" پیدا کر لیتا ہے۔ نہایت لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ نکتے سمجھنے سے تعلق رکھتے ہیں ؎

کے سبِ ہندوستاں آید بروزا | مردِ جعفر زندہ روحِ او ہنوز!
تا ز قیدِ یک بدن وا می رہد | آشیاں اندر تنِ دیگر نہد
گاہ او را با کلیسا سازِ باز | گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دینِ اُو آئینِ او سوداگری است | عنتری اندر لباسِ حیدری است
پیشِ ازیں چیزے دگر مسجودِ او | در زمانِ ما وطن معبودِ او
ظاہرِ او از غمِ دیں دردمند | باطنش چوں دیریاں زنار بند
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است | ایں مسلمانے کہن ملت کش است

جعفرِ زمانہ حال کی منافقت کا نمایاں ترین نشان یہ بتایا ہے (اور نہ معلوم وہ کون ہے!) ؎

خندہ خنداں است و با کس یار نیست | مار اگر خنداں شود جز مار نیست
از نفاقش وحدتِ قومی دو نیم | ملتِ او از وجودِ او لئیم

قومی وحدت کو دو نیم کرنے کے ذمہ دار آج ایک نہیں سینکڑوں ہیں۔

آنسوئے افلاک

آخری پرواز سپہر حدود افلاک سے پرے جانے کے لئے ہے۔ لیکن پیشتر اسکے کہ وہاں پہنچیں ایک اور جہاں دیکھا گیا ہے۔ جہاں ایک مرد جس کے لب پر ایک دردمند صدا جاری ہے نظر آتا ہے۔ رومی بتاتا ہے کہ یہ شخص حکیم المانوی نٹشا ہے۔ نٹشا کے متعلق مدت ہوئی اقبال کہہ چکا ہے ع

قلب او مومن دماغش کافر است

اب یہ بتایا کہ اس کی حقیقت یہ تھی کہ وہ بھی اپنی وضع کا منصور حلاج تھا جس کو اس کے ملک کے لوگوں نے نہ پہچانا منصور کی جان اگر ملا نے لی تو نٹشا کی طبیعت نے اگر یورپ میں کوئی اس مجذوب کی واردات کو سمجھنے والا ہوتا تو شاید وہ گم گشتہ نہ ہونے پاتا اگر عیسائیت کا پردہ چاک کرنے کے بعد وہ توحید کی طرف راہ نہ پا سکا تو اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ اسکو اس سمت پہ لگا لے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے انکار نے جہاں

ے نٹشا کو طبیبوں نے دیوانہ قرار دیا تھا۔ اقبال اسے مجذوب بتاتا ہے۔ برناڈ شا گو اس حقیقت سے واقف نہیں مگر وہ بھی نٹشا کو دیوانہ کہنے سے انکاری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا نے اسے دیوانہ کہنا شروع کر دیا۔

یورپ کے مروجہ معتقدات کے طلسم توڑ ڈالے وہاں وہ خود بھی ان میں گھر کر رہ گیا۔ تا آنکہ ؎

مستیِ او ہر زجاجے را شکست   از خدا ببرید و ہم از خود گسست

او بہ لا در ماند و تا اِلّا نرفت   از مقام عبدہٗ بیگانہ رفت

اقبال کا خیال ہے کہ شاید اگر مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی کے زمانہ میں پیدا ہوتا اور اس مردِ کامل کی صحبت اُسے کبھی نصیب ہو جاتی تو وہ منزلِ مقصود کو پہنچ جاتا ؎

کاش بودے در زمانِ احمدے   تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

جس قدر مجدد الف ثانی "مجذوبیت" کی قدیم اور بے پناہ رَو کو "سلوک" میں بدلنے میں کامیاب ہوا شاید اور کوئی مجدد یا ریفارمر اس بات میں اتنا کامیاب نہ ہوا ہوگا۔

حرکت بجنت الفردوس

اب مسافر کائنات کی حد سے باہر چلے جاتے ہیں اور جہانِ بے حیات میں قدم رکھتے ہیں۔ اس جہانِ بے حیات کے سلسلہ میں پھر زمان و مکاں کے مباحث نئے نئے رنگ میں پیش کئے ہیں۔ دوزخ

وبہشت کی حقیقت رومی کی زبان سے اِن الفاظ میں پیش کی ہے ۔

گفت رومی "اے گرفتارِ قیاس | درگذر از اعتبارات حواس
از تجلی کارہائے خوب و زشت | می شود آں دوزخ ایں گردد بہشت
اے کہ میتی قصرہائے رنگ رنگ | اصلش از اعمال وے از خشت و سنگ
آنچہ خوانی کوثر و غلمان و حور | جلوۂ ایں عالم جذب و سرور
زندگی ایں جا ز دیدار است و بس | ذوقِ دیدار است و گفتار است و بس

قصرِ شرف النساء

سب سے پہلا قصر جو جنّت میں نظر آیا وہ شرف النساء بیگم کا تھا شرف النسا نواب خان بہادر خاں کی بیٹی اور نواب عبد الصمد خاں کی پوتی تھیں۔ یہ دونوں باپ بیٹے بہادر شاہ اور شاہ عالم کے زمانہ میں یکے بعد دیگرے پنجاب کے گورنر تھے۔ اس عہد میں صوبوں کے حکمراں ایک طرح خود مختار ہو چکے تھے۔ تاہم دہلی کے مغل شاہنشاہ کو خراج دیا جاتا تھا۔ اور اہم شہنشاہی فرمانوں کی تعمیل ہوتی تھی۔ یہ عبد الصمد خاں وہی ہیں جنہوں نے پنجاب میں بندہ بہادر کے فتنہ کو دبایا اور اسے قید کر کے دہلی پہنچایا۔ اس زمانے میں پنجاب کا گورنمنٹ ہاؤس وہ جگہ تھی۔ جہاں شہر کی شمالی جانب شالامار کو جاتے ہوئے بیگم پورہ کا گاؤں آباد ہے۔ نواب عبد الصمد خاں

کی بیگم کے نام پر ہی اس جگہ کا نام بعد میں مشہور ہوا۔ نواب عبدالصمد خاں اور اُسکے بیٹے نواب خان بہادر خاں کی قبریں بیگم پورہ میں چار دیواری کے اندر موجود ہیں۔ اس گورنمنٹ ہوس کی عمارتوں کے کھنڈر اور بعض مساجد و مقابر اب تک کھڑے ہیں۔ انہیں مقبروں میں شرف النسا بیگم کا مقبرہ ہے۔ شرف النسا بیگم نے محلات شاہی کے احاطہ میں ایک چبوترہ بنوا رکھا تھا۔ جس پر سیڑھی لگا کر چڑھا جاتا تھا۔ ان کا معمول تھا کہ ہر روز صبح کی نماز کے بعد چوتا اُتار کر اس چبوترہ پر بیٹھ جاتیں اور قرآن کی تلاوت کرتیں۔ ایک مرصع تلوار پاس ہوتی تھی جب تلاوت ختم کر لیتیں تو قرآن کو بند کر کے وہیں پڑا رہنے دیتیں اور اُسکے ساتھ تلوار رکھ کر نیچے آجاتیں مرتے وقت وصیت کی کہ مجھے اسی چبوترہ پر دفن کیا جائے۔ اور وہ قرآن و تلوار قبر کے اوپر ہمیشہ کیلئے محفوظ رکھے رہیں۔ چنانچہ وفات کے بعد انہیں وہیں دفن کیا گیا۔ پھر اس چبوترہ پر گنبد بنا۔ اب اس گنبد کو دیکھیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دو منزلہ گنبد کیوں تعمیر ہوا۔ لیکن اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ مقبرہ کی بالائی دیواروں کے باہر سرو کے درخت ہیں۔ اور ان کی وجہ سے لوگ اب اس مقبرہ کو سرو والا مقبرہ کہتے ہیں۔

اقبال نے شرف النسا بیگم کا جو قصر جنت میں دکھایا ہے وہ لعل ناب سے تعمیر ہوا ہے جو اپنی ضوفشانی میں آفتاب سے خراج وصول

کرتا نظر آتا ہے۔ جب زندہ رود رومی سے سوال کرتا ہے کہ یہ کاشانہ کس کا ہے۔ تو موخرالذکر اس کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

قلزمِ ما ایں چنیں گوہر نزاد / ہیچ مادر ایں چنیں دختر نزاد
خاکِ لاہور از مزارش آسماں / کس نداند رازِ او را در جہاں

اس کے بعد شاعرانہ انداز میں شرف النسا کے وہی حالات بیان کئے ہیں جو اوپر درج ہوئے۔ ماں کو جو آخری وصیت شرف النساء نے کی اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

بر لبِ او چوں دمِ آخر رسید / سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر / سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند / کائناتِ زندگی را محور اند
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس / دخترت را ایں دو محرم بود و بس
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن / تیغ و قرآں را جدا از من مکن
مومناں را تیغ با قرآں بس است / تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

حسبِ وصیت تیغ و قرآن شرف النسا کی قبر پر ایک مدت تک محفوظ پڑے رہے۔ لیکن سنہ ۱۷۴۵-۴۶ء کے ان ہنگاموں میں جو سکھوں میں خانہ جنگی کی وجہ سے لاہور میں رونما ہوئے تاریخ میں لکھا ہے کہ سکھ سرداروں نے یہ سُن کر کہ اس دو منزلہ مقبرہ میں کوئی خزانہ مدفون ہے۔

اس پر چڑھ کر اس کو کھولا اور تو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ وہ تیغ و قرآن ضرور وہاں سے نکال لئے۔ رومی کہتا ہے۔

عمر با در زیرِ ایں زرّیں قباد ۔۔۔ بر مزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہانِ بے ثبات ۔۔۔ اہلِ حق را داد پیغامِ حیات
تا مسلماں کرد با خود آنچہ کرد ۔۔۔ گردشِ دوراں بساطش در نورد
مردِ حق از غیرِ حق اندیشہ کرد ۔۔۔ شیرِ مولا روبہی را پیشہ کرد
از دلش تاب و تبِ سیماب رفت ۔۔۔ خود بداں از آنچہ بر پنجاب رفت
خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد ۔۔۔ اندراں کشور مسلمانی بمُرد

جاوید نامہ میں یہی ایک مقام ہے جہاں پنجاب کے مسلمانوں کی تاریخ کا یہ ایک درد انگیز منظر پیدا ہے۔

قصرِ شرف النساء کی زیارت کے بعد حضرت سیّد علی ہمدانی اور ملّا طاہر غنی کشمیری سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان مکالمات میں خطۂ کشمیر کے ماضی و حاضر اور مستقبل پر ان خیالات و جذبات کا ایک سماں پیدا کیا ہے، کہ اگر آج اہلِ خطہ ان سے روشناس ہو جائے تو زندگی کی تازہ لہر جواب ان کی رگوں میں دوڑنے لگی ہے۔ ایک نئی عمر عزت و حرارت اختیار کرے۔ کشمیر کے گذشتہ اور موجودہ پالٹکس خطہ کا مہاراجگان کشمیر کے پاس بیچا جانا۔ یہ سب واقعات جن [illegible] ہیں

ادا ہوئے ہیں وہ نشتر بنکر دل کے پار ہو جانے والے ہیں۔ شاعر سرینگر کے نواح میں نسیم باغ اور نشاط باغ کی سیر و سیاحت کے لطف اُٹھا رہا ہے۔ ان کے جوش بہار کے منظروں سے مسرور ہو کر ”وشبنوا رسنی“ کے نغمے الاپنے لگتا ہے۔ ایک پرندہ ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا ہوا اُسے مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یہ بہار اور اسکے یہ موسم ہمارے لئے جو اس خطہ کے رہنے والے ہیں پر پشہ کی حیثیت نہیں رکھتے کیوں؟ اس لئے ہ

لالہ است و نرگسِ شہلا دمید | بادِ نوروزی گریبانش درید
عمرہا بالید ازیں کوہ و کمر | نسترن از نورِ قمر پاکیزہ تر
عمرہا گل رخت بربست و کشاد | خاکِ ما دیگر شہابؔ الدین[۱] نزاد

اس پرندہ کا نغمہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک مرد دیوانہ جوش و خروش میں ایک نالۂ مستانہ کرتا اور شاعر کو یہ کہتا سنا گیا ہ

بگذر ز ما و نالۂ مستانہ مجوے | بگذر ز شاخِ گل کہ طلسمی است رنگ و بوے

یہ جو بظاہر پرندہ درخت کی ٹہنی پر تم نے گیت گاتا سنا ہے۔ وہ دراصل غنیؔ کی روح ہے جو مرگِ آرزو کی ماتمی ہو کر پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہے ہ

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی | حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گوے
دہقان و کشت و جوے و خیاباں فروختند | قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

[۱] یکے از سلاطین مشہور کشمیر۔

آگے چل کر غنی شاعر کو پھر بتاتا ہے کہ اہلِ خطّہ کے مستقبل سے

نااُمید نہ ہو سہ

باش تا بینی کہ بے آوازِ صُور | ملّتے برخیزد از خاکِ قبور
شہرہا زیرِ سپہرِ لاجورد | سوخت از سوزِ دلِ درویش مرد
سلطنت نازک تر آمد از حباب | از دمے او را تواں کردن خراب

یہ اشعار اُس وقت لکھے گئے تھے جب ابھی کشمیر کے موجودہ انقلاب کا وہم بھی اہلِ خطّہ کو نہ آیا ہوگا۔ افسوس کہ جاوید نامہ کی طباعت میں تاخیر کی وجہ سے اب آکر شایع ہوئے۔

شاہ ہمدانی کی زبان سے فقیری و شاہی اور "تخت و تاج" کی اصلیت کے متعلق ان گرانبہا اسرار و حقائق کا اظہار کیا گیا ہے کہ ان کا جاننا تمام اقوام کی سیاسی رہنمائی کا باعث ہو۔

اسکے بعد ہندوستان کے مشہور شاعر برتری ہری سے مل کر سوال کیا جاتا ہے کہ شعر کیا چیز ہے۔ پھر ہندوستان کے موجودہ سیاسی پیچ و تاب پر اس کی رائے دریافت کی جاتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں برتری ہری کی ایک خاص نظم کا فارسی ترجمہ درج کیا ہے

کاخ سلاطین مشرق

اس منظر سے گزر کر کاخ سلاطین مشرق میں نادر شاہ ابدالی اور سلطان

شہید (ٹیپو) سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ نادر ایرانیوں کی موجودہ حالت دریافت کرتا ہے۔ زندہ رود ایرانیوں کے تمام وہ موجودہ رجحانات انکے سامنے بیان کرتا ہے۔ جو "اسلامیت" اور "عربیت" سے ہٹا کر ان کو "ایرانیت" کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اور افرنگی قومیت کی تقلید پر ان کو گامزن کر رہے ہیں۔

ابدال کا پیغام ملت افغانیہ کے نام ہے۔ ایشیا میں بحیثیت قوم افغانوں کی سیاسی اہمیت پر بحث کی ہے۔ افغانوں کو نصیحت کی ہے۔ کہ جس طرح ترک فرنگیوں کی تقلید سے اپنے آپ کو کھو رہے ہیں۔ تم ان کی پیروی سے بچنا اور اپنی خصوصیات کو محفوظ رکھنا۔ رضا شاہ پہلوی اور نادر خاں موجودہ حکمران افغانستان کو سیاسیات کے بعض اہم نکات سمجھائے گئے ہیں۔

سلطان شہید ٹیپو زندہ رود سے ہندوستان کا حال دریافت فرماتے ہیں۔ زندہ رود بتاتا ہے کہ اس وقت سول نافرمانی کا دور دورہ ہے ؎

ہندیاں منکر ز قانونِ فرنگ در نگیرد سحر و افسونِ فرنگ

سلطان اپنے دکن کے حالات دریافت کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا دکن میں بھی کوئی آثارِ حیات پیدا ہیں۔ اقبال کو اپنا دکن کا سفر یاد آ جاتا ہے جواب میں کہتا ہے ؎

تخم اشکے ریختم اندر دکن　　لالہ روید ز خاکِ آں چمن

سرنگاپٹم میں میرے محلات کے نیچے بہنے والی کاویری چرا پنے اندر نئی موجیں پیدا کر رہی ہے ؎

رودِ کاویری مدام اندر سفر　　دیدہ ام در جانِ او شورِ دگر

"سلطان" "زندہ رود" کو دریائے کاویری کے نام اپنا پیغام دیتا ہے۔ اس پیغام میں حقیقت حیات و مرگ اور شہادت پر حیرت انگیز خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

آخری مناظر فردوس بریں سے رخصت ہونے کے ہیں۔ حورانِ بہشتی شاعر سے شعر سنانے کا تقاضا کرتی ہیں۔ یہ فرمائش قبول کی جاتی ہے۔ اور ایک غزل سے انہیں مسرور کیا جاتا ہے۔

اسکے بعد عین وو حضور" میں حاضری ہے۔ تجلی ذات کے مباحث ایسے ہیں کہ اقبال کو انہیں لکھنے میں کبھی صبر نہیں آتا۔ علم و عشق کے حقائق نئے الفاظ اور نئے پیرائے میں پھر پیش کر دیئے ہیں۔ لذتِ دیدار سے بہرہ یاب ہو کر بارگاہِ سرمدی میں کچھ التجائیں کی ہیں۔ وہ التجائیں یہی ہیں کہ اس سفلی خاکدان سے نکال کر کہیں اور جگہ ہم کو پھینک ؎

ایں جنیں عالم کجا شایانِ تست　　آب و گل داغے کہ بر دامانِ تست

مگر "صدائے جمال" نے جمالی انداز میں انتباہ کیا ؎